تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہنامہ

مفاہیم

کراچی

جنوری ۲۰۲۱ء

شمارہ ۳

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

جلد ۱

لیتفقہوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
اقبال

مَن يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ

ماہنامہ

مفاہیم

کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

حافظ حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- حافظ سید اسامہ علی
- استاذ ابرار حسین
- استاذ عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

فہرست

اداریہ ۴

درسِ قرآن .... مولانا محمد اقبال ۸

درسِ حدیث .... ابنِ عباس ۱۳

نیکیوں میں جلدی کریں .... ڈاکٹر محمد رشید ارشد ۱۴

سوانحِ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (۲) حافظ حماد احمد ترک ۲۹

تفقہ فی الدین (۲) .... صوفی جمیل الرحمٰن عباسی ۵۳

اختلاف فقہاء کی حقیقت .... حافظ معاذ بن تجمل ۶۶

فتاویٰ یسئلونک .... دارالافتاء والارشاد ۷۱

نعت .... مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ ۷۴

اداریہ

آسماں بے ردا، نہ ہو جائے

قیامت آئے گی، اور اس سے آگے اس کی نشانیاں، تو علم اٹھایا جائے گا لیکن سینوں سے نہیں بلکہ شہروں سے اور ہم نے شہروں میں عالِموں کو علم سمیت اٹھتے دیکھا تو شہروں کو روتا پایا۔ آخر موت پہ رونا کس کو نہیں آتا اور عالِم کے اٹھنے کو عالَم کی موت یونہی تو نہیں کہا گیا، ظلمت کو موت یا جہل سے تشبیہ دی جائے اور ظلمت کدے کو گورستان سے، تو اس میں کوئی قباحت نہیں اور نور کو علم یا روحِ زندگی سے تعبیر کیا جائے تو اچھا ہی ہے اس لیے کہ وحیِ ربانی میں اس طرح کے اشارے بے شمار ملتے ہیں: ﴿أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ﴾ ”ارے دیکھو وہ جو مردہ تھا ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کو روشنی دی جسے لیے وہ لوگوں میں پھرتا ہے کیا اس کی طرح ہو سکتا ہے جو اندھیریوں میں ہے“ ۔ صاحب زاد المسیر رحمہ اللہ نے نور کی تفسیر میں تین اقوال نقل کیے ہیں: ہدایت، قرآن پاک اور عِلم، اور ظاہر ہے ان تینوں تعبیرات میں کوئی تباین نہیں ہے۔

اندھیروں کا مسافر، انسان تمام مخلوق کی طرح ظلمتوں میں پیدا ہوا، ہاں! پھر جس کو اللہ نے اپنے نور سے نوازا وہی حیاتِ ہدایت سے متّصف ہوا: ﴿إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ خَلَقَ خَلْقَهُ فِي ظُلْمَةٍ، ثُمَّ أَلْقَى عَلَيْهِمْ مِنْ نُورِهِ يَوْمَئِذٍ، فَمَنْ أَصَابَهُ مِنْ نُورِهِ يَوْمَئِذٍ، اهْتَدَى، وَمَنْ أَخْطَأَهُ، ضَلَّ﴾ (مسند احمد) ”بے شک اللہ عزوجل نے مخلوق کو ظلمتوں میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا نور ڈالا پس اس دن وہ نور جس پہ پڑا وہ ہدایت یافتہ ہوا اور جس پہ وہ نور نہیں پڑا وہ گمراہ ہی رہا“۔ ایک حدیث میں زندگی کو علم سے مستعار بتایا گیا: ﴿سَتَكُونُ فِتَنٌ يُصْبِحُ الرَّجُلُ فِيهَا مُؤْمِنًا وَيُمْسِي كَافِرًا إِلاَّ مَنْ أَحْيَاهُ اللهُ بِالْعِلْمِ﴾ (مسند احمد) ”عنقریب فتنے ہوں گے بندہ صبح کو مومن ہو گا اور شام کو حالت کفر میں ہو گا سوائے اس کے جسے اللہ علم کے ذریعے زندگی عطا کرے“، تو علم کے ذریعے ہی زندگی ہے جیسا حضرت فتح موصلی رحمہ اللہ نے کہا: الْقَلْبُ إِذَا مُنِعَ عَنْهُ الْحِكْمَةُ وَالْعِلْمُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ يَمُوتُ (احیاء علوم الدین) ”جب تین دن تک دل

کو علم و حکمت سے محروم رکھا جائے تو وہ مر جاتا ہے" جب علم دلوں کی زندگی قرار پایا تو اس کے حامل ہونے کے سبب، علماء کو بھی محی القلوب کہا جا سکتا ہے۔ حضرت لقمان سے منسوب وصیتوں میں سے ایک عام نصیحت یہ بھی ہے: جَالِسِ الْعُلَمَاءَ وَزَاحِمْهُمْ بِرُكْبَتَيْكَ فَإِنَّ اللهَ سُبْحَانَهُ يُحْيِي الْقُلُوبَ بِنُورِ الْحِكْمَةِ كَمَا يُحْيِي الْأَرْضَ بِوَابِلِ السَّمَاءِ (احیاء علوم الدین) "علماء کی مجالست اختیار کر اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے رکھ پس بے شک اللہ تعالیٰ نورِ علم و حکمت سے دلوں کو اسی طرح زندہ کرتا ہے جس طرح آسمان کی بارشوں سے زمین کو زندہ کرتا ہے"۔ تو جب دلوں کے اجیالے علماء میں سے کوئی اٹھا لیا جائے تو سمجھو زندگی گھٹتی اور گھٹتی جا رہی ہے۔ تو ہم نے شہر کے شیروں کو بھی روتے دیکھا اور مگرمچھ کے آنسو لیے شریروں کو بھی روتے دیکھا، وہ جو ﴿يَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ﴾ " عدل و قسط کا حکم کرنے والے لوگوں کو قتل کرتے ہیں" تو قتل کرنے والے بھی روئے، قتل کرانے والے بھی اور قتل ہو جانے دینے والے بھی، تو ان فساق کا رونا اُن کے رونے جیسا ہے جو صبح دم غیابات الجب میں پھینکتے ہیں اور دمِ عشا گریہ و زاری کرتے ہیں، سو ان کو تو وَاللهُ الْمُسْتَعَانُ کا پیغام ہے۔

لیکن عُشاقِ کا رونا معرفت کا رونا ہے، بلکہ یہ تو معرفت کے جاتے رہنے کا رونا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ لفظ اب ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال کھنکتا ہے۔ معنی والے گئے تو سمجھو معنی چلے گئے تو عالموں کے بعد رونا ہی چاہیے کہ دین غیر اہل کے مرہون ہونے جا رہا ہے: وَلَكِنِ ابْكُوا عَلَيْهِ إِذَا وَلِيَهُ غَيْرُ أَهْلِهِ (مسند احمد) "لیکن دین پر رویا کرو جب وہ غیر اہل کے سپرد کیا جانے لگے"۔ پیاسا جتنا بھی پیاسا ہو کنواں نہیں پی سکتا، اسی طرح طالب جتنا بھی صادق ہو عالم سے اس کا پورا پورا علم نہیں سیکھ سکتا، کچھ کمی رہ ہی جاتی ہے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جب ان کی جنت کے باغیچے میں اتارا گیا تو ان کے شاگرد حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ نے فرمایا: لَقَدْ ذَهَبَ الْيَوْمَ عِلْمٌ كَثِيرٌ (مجمع الزوائد) "آج تو علم کثیر چلا گیا" ہمیں تو لگتا ہے وہ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میرے ہاتھوں سے چلا گیا۔ اگرچہ سیدنا زید بن ثابت، اللہ تعالیٰ کے اچھی طرح جاننے والے تھے لیکن ان کے علم پر غلبہ فقہ و روایت کا ہی تھا تو انہیں عالمِ بامر اللہ کہا جا سکتا ہے تو یہ امر اللہ کا علم تھا جس کا ایک حصہ آج ہاتھوں سے چلا جا رہا تھا۔ ہم جو کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں۔۔۔

ذوق سے جانتے ہیں کہ ہمارے بڑوں کے گزرنے سے خیر کا دور بھی گزر گیا کہ ہم وقت کی مہلت سے فائدہ اٹھا کر ان کا سبق ازبر نہیں کر پائے تو اب ہلاکت و فلاکت کے سوا بچا کیا ہے، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لاَ يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا بَقِيَ الأَوَّلُ حَتَّى يَتَعَلَّمَ الآخِرُ، فَإِذَا هَلَكَ الأَوَّلُ قَبْلَ أَنْ يَتَعَلَّمَ الآخِرُ هَلَكَ النَّاسُ (سنن دارمی) ''پہلوں کی زندگی ہی میں اگر ان کے پچھلے (ان سے) علم حاصل کر لیں تو لوگ خیر پر رہیں گے اور جب بعد والوں کے علم حاصل کر چکنے سے پہلے اگلے انتقال کرنے لگیں تو لوگوں کی ہلاکت ہے''۔

وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللهِ﴾ '' میں تم سب سے زیادہ اللہ کا جاننے والا ہوں''، تو علم کی ایک دوسری قسم علم باللہ بھی ہے اللہ کی معرفت و خشیت کا سیکھنا اور سکھانا یہاں کا خاص وظیفہ ہے۔ اس کے جاننے والے بھی جب جاتے ہیں تو بہت کچھ ساتھ لے جاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انتقال کے موقع پر سیدنا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ نے فرمایا: لقد مات تسعة أعشار العلم ''یقینا نوے فیصد علم فوت ہو گیا''۔ جب لوگوں نے بات کو نہیں سمجھا تو وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: إنما أريد العلم بالله ''میری مراد علم باللہ سے تھی'' (احیاء علوم الدین)۔

تو امسال، بڑے بڑے علماء اٹھتے جا رہے ہیں۔ وہ بھی جن کی ذات میں امر اللہ کے علم کا غلبہ تھا اور کچھ دوسرے بھی جو عالِم باللہ کے طور پر زیادہ مشہور تھے۔ اس میدان کی کیا بتائیں؛ اکیلے شیخ الحدیث مولانا زکریا علیہ الرحمہ کے تین خلفائے کرام نے اس سال جامِ وصال نوش کیا۔ جنوبی افریقہ سے مولانا یوسف متالہ صاحب اور اسلام آباد سے مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی، رب کو عزیز ہوئے تو لاہور سے حافظ صغیر احمد صاحب اللہ کو پیارے ہوئے۔ پڑوسی ملک میں جامع العِلمان (یعنی علم باللہ اور علم بامر اللہ) حضرت مولانا افتخار الحسن صاحب کاندھلوی خلیفۂ مجاز عبد القادر رائے پوری نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ فجر کے بعد والے درسِ قرآن کو ۵۲ سال جاری رکھنے اور پانچ دور مکمل کرنے کا افتخار بھی آپ ہی کو حاصل ہے۔

علم بامر اللہ میں شہرت رکھنے والے علماء میں دیکھیں تو ہندوستان میں حجۃ اللہ البالغہ کے شارح شیخ الحدیث مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری رحمہ اللہ، رحمۃ اللہ الواسعہ کے سپرد ہوئے۔ یہیں '' تحریک آزادی میں علمائے کرام کا کردار''

کے مصنف حضرت مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی رحمہ اللہ اسی سال قید حیات سے آزاد ہو کر علمائے رفتگاں سے جا ملے۔ یادگارِ اسلاف، قاطعِ قادیانیت حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود لندن سے خلد آشیاں ہوئے۔ مولفِ الجامع الكامل في الحديث الصحيح الشامل، امام بیہقی کی سنن الصغری کے شارح اور المدخل إلى السنن الكبرى کے محقق، ہندوستانی نزاد، گنگا سے زمزم کا سفر طے کرنے والے محدث حضرت مولانا ضیاء الرحمن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ، نے مدینہ منورہ میں رحلت فرمائی۔ منفرد لہجے کے قاریٔ قرآن جناب نورین محمد صدیق، سڑک کے حادثے میں جاں بہ حق ہوئے۔ پاکستان کی بات کریں تو مسلکِ اہلِ حدیث کے نمائندہ، عالم باعمل صاحب تفسیر احسن البیان حافظ صلاح الدین یوسف صاحب نے لاہور میں انتقال کیا۔ مولفِ المقالات المختاره في الكتاب و السنة، تاریخِ اسلامی جمہوریہ پاکستان، نالج اینڈ سوی لائزیشن ان اسلام، سابقہ استاد بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی ملائشیا، مہتمم اور شیخ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی جناب ڈاکٹر مولانا عادل خان صاحب کو کراچی میں شہید کر دیا گیا۔

ماہر بالقرآن شیخ التفسیر حضرت مولانا مفتی زرولی خان صاحب کو کراچی سے ' کرامِ بررہ' اپنی معیت میں لے کر چلتے بنے۔ ان کا دورۂ تفسیر مشہور تھا۔ معنی خیز نکتہ آفرینی ان پر ختم تھی۔

ختمِ نبوت اور ناموسِ رسالت ﷺ کے سپاہی جناب علامہ خادم حسین رضوی صاحب کے صاحبزادے کے مطابق زندگی کے آخری لمحات میں وہ روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے تصور سے شرمسار تھے کہ گستاخانہ سرگرمیاں جاری ہیں تو ہم کیا منھ لے کر حضور کے دربار میں جائیں گے، لیکن یہ ان کی شرمساری ان کی حساسیت پر مبنی تھی، وہ ایک عرصہ ناموسِ رسالت ﷺ کے محاذ پر ڈٹے رہے۔ زمانہ گواہ ہے کہ وہ ناموسِ مصطفی کی کوشش میں حدِ استطاعت تک پہنچ گئے تو خدا کے ہاں ان شاء اللہ حفاظت کرنے والے قرار پائے، سو شانِ کریمی کو ان کی ادائے عاجزی پسند آئی اور انھیں حضور ﷺ کی زیارت کے لیے بلا لیا۔ حدیث مسند احمد میں علماء کو ﴿النُّجُومُ فِي السَّمَاءِ﴾ '' آسمان کے تارے '' اور قولِ فاروقی میں ﴿لله رداء﴾ '' اللہ تعالی کی رِدا '' کہا گیا (احیاء علوم الدین)

تارے گرتے جا رہے ہیں آگے جانے کیا ہو!!

روز ٹوٹے ہیں تارے قسمت کے　　　　آسماں بے ردا نہ ہو جائے درسِ قرآن

درسِ قرآن

مولانا محمد اقبال

سورہ البقرۃ آیت نمبر۸۱

﴿بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَـٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

(آگ تمھیں) کیوں نہیں (چھوئے گی)؟ جو لوگ بھی بدی کماتے ہیں اور ان کی بدی انہیں گھیر لیتی ہے تو ایسے لوگ ہی دوزخ کے باسی ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

توضیح وتفسیر

پس منظر: یہود خود کو اللہ کا چہیتا سمجھتے تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے بغیر، اور بداعمالیوں کے باوجود مستحق جنت ہونے کے دعوے دار تھے اور کہتے تھے اگر ہم دوزخ میں ڈالے بھی گئے تو گنتی کے چند دن ﴿وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً﴾ ان کی اس زعم باطل کی نفی میں یہ آیت وارد ہوئی ہے۔

سَيِّئَةً سے کیا مراد ہے؟

سَيِّئَةً کا معنی برائی ہے لیکن اس آیت میں اس سے عام برائیاں مراد نہیں ہیں بلکہ یہاں ایک خاص اعتقادی برائی کفر و شرک مراد ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین علیہم الرحمۃ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ امام مجاہد علیہ الرحمۃ نے فرمایا: ﴿بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ أي 'شِرْكًا' "کیوں نہیں جو لوگ سَيِّئَة کا ارتکاب کرتے ہیں یعنی شرک کا"۔ امام قتادہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: أما السيئة فالشرك، "سیئہ سے مراد شرک ہے"۔ اسی طرح ابو وائل رحمۃ اللہ علیہ نے سیئہ کی تفسیر اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے سے کی ہے۔ (طبری، ج:۱، ص:۳۰۷) امام طبری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں اس آیت میں وہ لوگ جو ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، یہود ہیں جو کہتے تھے: "ہمیں گنتی کے چند دنوں کے علاوہ آگ ہرگز نہیں چھوئے گی"۔ (بقرۃ:۸۰) ان کے متعلق فرمایا، شرک اور کفر کی وجہ سے ان کو عذاب دیا جائے گا، اور ان کے

گناہوں نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے، اس لیے وہ مخلد فی النار ہوں گے۔ اس موقعے پر اللہ تعالیٰ نے سیئۃ ذکر فرمایا ہے جس سے مراد کفر اور شرک ہے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ﴿من عمل مثل عملکم یا یهود،وکفر بمثل ما کفرتم به،حتی یحیط کفره بماله من حسنات،فأولئک أصحاب النار هم فیها خالدون﴾۔ "اے یہود! جس نے تمھارا جیسا عمل کیا اور جس چیز کا تم انکار کرتے ہو اس کا ایسا ہی انکار کیا، یہاں تک کہ اس کا کفر اس کی تمام حسنات گھیر لے، تو ایسے لوگ آگ والے ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔ (ابنِ کثیر)

اس بحث سے یہ بات پتا چلی کہ مذکورہ آیت میں سیئۃ سے مراد شرک و کفر ہے، اور یہی اہل سنت والجماعت کے مذہب کے مطابق ہے۔ اس سے عام کبائر مراد نہیں لیے جاسکتے جیسا کہ معتزلہ اور خوارج کا مذہب ہے۔ اور اس آیت مبارکہ کے سیاق و سباق سے پتا چلتا ہے کہ اس میں اہل کفر کے انجام سے بحث ہوئی ہے، اہل ایمان کے متعلق سرے سے بحث ہی نہیں ہو رہی۔ امام نسفی تفسیر میں لکھتے ہیں: إذا مات مؤمناً فأعظم الطاعات وهو الإیمان معه فلا یکون الذنب محیطاً به فلا یتناوله النص "جب کوئی مسلمان فوت ہوتا ہے تو طاعتوں میں سب سے بڑی طاعت یعنی ایمان اس کے ساتھ ہوتا ہے، تو گناہ اسے احاطہ نہیں کر سکتا۔ پس اس پر اس آیت کا اطلاق نہیں ہو سکتا"۔

﴿وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ﴾

اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہاں بھی شرک ہی مراد ہے۔ امام طبری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: والمراد بالخطیئة هنا الشرک،أي إنه أشرک وأحدق به شرکه،ومات علیه ولم یتب منه، "یہاں خطیئہ سے مراد شرک ہے یعنی وہ شخص جو شرک میں مبتلا ہو اور شرک اس کا احاطہ کرے، وہ اسی حالت میں مر جائے اس سے توبہ کیے بغیر۔" امام طبری علیہ الرحمۃ نے اس کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے: ﴿وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ﴾ یحیط کفره بماله من حسنة "ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اور ان کی بدی انھیں گھیر لیتی ہے، ان کا انکار اور کفران کی حسنات کا احاطہ کر لیتا ہے"۔ اسی طرح ابن جریج علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں میں نے عطا سے دریافت کیا، ما هي الخطیئة في قوله ﴿وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ﴾ قال: هي الشرک،ثم تلا قوله تعالی ﴿

وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ ”اللہ تعالیٰ کے اس قول﴿وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ ﴾ سے کیا مراد ہے؟ توانھوں نے کہا خطیئہ شرک کو کہتے ہیں، پھر عطا نے یہ آیت تلاوت فرمائی ”اور جو کوئی برائی لے کر آئے گا، تو ایسے لوگوں کو منھ کے بل آگ میں ڈال دیا جائے گا“۔(طبری، ج:۱، ص:۳۱۰)

یہاں معلوم ہوا کہ خطیئہ سے عام کبائر مراد نہیں بلکہ شرک مراد ہے، یہی اسلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین علیہم الرحمۃ سے منقول ہے اور اسی کو محققین نے اختیار فرمایا ہے۔ انہی تفسیرات کی روشنی میں اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ آیت زیر مطالعہ میں خلود فی النار کی وعید کفر و شرک کے ارتکاب پر ہے اور اگر کوئی مسلمان کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اس کے لیے خلود فی النار کی سزا نہیں ہے۔ مسلمان گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اسلام سے خارج یا کافر نہیں ہوتا، البتہ گناہ گار ضرور ہوتا ہے۔ اگر وہ اس گناہ سے توبہ نہ کرے تو دخول فی النار کا مستحق تو ہوگا مگر خلود فی النار یعنی ہمیشہ جہنم میں جانے کا مستحق نہیں ہوگا۔ بلکہ سزا کاٹنے کے بعد جنت میں جائے گا۔ اگر اللہ چاہے تو اسے اپنے لطف و کرم سے معاف کر کے شروع ہی میں جنت میں داخل کریں۔

ان آیات کی غلط تعبیرات

علامہ زمخشری جو معتزلہ کے بڑے عالم ہیں انہوں نے آیت زیر مطالعہ میں وراد لفظ سَیِّئَة کی تفسیر کبیرۃ من الکبائر ”کبیرہ گناہوں میں سے کوئی گناہ“ سے کی ہے۔(کشاف، ج:۱، ص:۱۵۹) اس بنیاد پر انھوں نے کہا کہ کوئی مسلمان اگر کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو اور وہ توبہ کیے بغیر مر جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے دوزخی ہے۔ خوارج نے بھی معتزلہ کی طرح سَیِّئَة سے کبیرہ گناہ مراد لیا اور کہا کہ اس آیت میں کبیرہ گناہ کرنے والے کے لیے خلود فی النار کی وعید وارد ہوئی ہے جو مسلمانوں کی نہیں بلکہ کافروں کی سزا ہے، اس سزا سے معلوم ہوا کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے اگرچہ پہلے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ ان دونوں گروہوں کے نزدیک کبیرہ گناہ کا مرتکب مسلمان ہمیشہ کے دوزخی ہے۔

عصر حاضر میں بعض لوگوں نے اس آیت کے ذیل میں یہی نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر انسان جانتے بوجھتے ایک کبیرہ گناہ بھی اختیار کر لے اور بغیر توبہ مر جائے تو اسے ہمیشہ کے دوزخ کی سزا دی جائے گی۔

درست تعبیر

اس آیت کی تفسیر کے بارے میں معتزلہ اور خوارج اور ان کے مماثل گروہوں کا نقطۂ نظر درست نہیں ہے۔ اس کی متعدّد وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ ان کے مذہب کو درست تسلیم کر لینے سے رسول اللہ ﷺ کی ان، ان گنت احادیث کا انکار لازم آئے گا جو عصاۃ مسلمین کی شفاعت اور سزا کاٹنے کے بعد جنت میں ان کے داخلے کے متعلق ہیں: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: ﴿أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَعَلَيْهِ ثَوْبٌ أَبْيَضُ وَهُوَ نَائِمٌ ثُمَّ أَتَيْتُهُ وَقَدِ اسْتَيْقَظَ فَقَالَ: «مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ ثُمَّ مَاتَ عَلَى ذَلِكَ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ، قُلْتُ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ قَالَ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ قُلْتُ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ قَالَ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ قُلْتُ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ قَالَ: وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ عَلَى رَغْمِ أَنْفِ أَبِي ذَرٍّ وَكَانَ أَبُو ذَرٍّ إِذَا حَدَّثَ بِهَذَا قَالَ وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍ﴾ ”میں ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ ایک سفید کپڑے میں آرام فرما رہے تھے۔ پھر میں دوبارہ آیا تو آپ ﷺ جاگ رہے تھے، اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص نے یہ کہا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور پھر اسی پر اسے موت آجائے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔“ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک خوش گوار تعجب ہوا، میں نے کہا: چاہے اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو“ میں نے پھر عرض کیا: چاہے اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو“ میں نے حیرت سے سہ بارہ عرض کیا: چاہے اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”چاہے اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو، باوجودیکہ ابوذر کی ناک خاک آلود ہو (یعنی اگر چہ ابوذر کو ناگوار گزرے)“۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ جب یہ حدیث بیان کرتے تو یہ الفاظ بھی بیان فرماتے تھے، اگر چہ ابوذر کو ناگوار گزرے“۔ (متفق علیہ)

ایک طویل حدیث میں لوگوں کو دوزخ کی سزا بھگت کر نکالنے کا ذکر ہے اس میں الفاظ آتے ہیں: ﴿فَيُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَمْ يَعْمَلُوا خَيْرًا قَطُّ﴾ ”پس پھر وہ اس میں سے ان لوگوں کو نکالے گا جنھوں نے کبھی کوئی نیکی کی ہی نہ تھی“۔ (متفق علیہ) دوسری وجہ یہ ہے کہ معتزلہ، خوارج اور دوسرے گروہوں کی تعبیرات کو ماننے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور

تابعین کرام رحمھم اللہ اجمعین کی تفسیر کی تغلیط کرنا پڑتی ہے جو جائز نہیں ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ معتزلہ و خوارج کے نقطہ نظر کو تسلیم کرنے میں اجماع امت کی خلاف ورزی لازم آتی ہے جو ایک ناجائز کام ہے۔

اہلِ سنت اور دوسرے فرقوں کے درمیان، ایمان و اسلام کا اختلاف

اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک ایمان تصدیق قلبی اور اقرار باللسان کو کہتے ہیں، جبکہ معتزلہ اور خوارج کہتے ہیں کہ تصدیق اور اقرار کے ساتھ اعمال بالجوارح بھی ایمان کا حصہ ہیں، یعنی وہ اعمال کو جزوایمان سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک مرتکب گناہ کبیرہ اسلام سے خارج ہے۔ یہاں تک تو خوارج اور معتزلہ دونوں کا اتفاق ہے مگر آگے اس کی تفصیل میں یہ دونوں باہم مختلف ہیں، خوارج کہتے ہیں مرتکب کبائر، اسلام سے خارج اور کافر ہے۔ معتزلہ کا موقف ہے کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا اسلام سے تو خارج ہے مگر کافر نہیں۔ وہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک درجے کے قائل ہیں جسے یہ منزلۃ بین المنزلتین ''دو منزلوں یعنی ایمان اور کفر کے بیچ میں ایک منزل'' کہتے ہیں۔ تو ان کے نزدیک جو شخص کبائر کا مرتکب ہو وہ ایمان سے نکل جاتا ہے جبکہ کافر نہیں ہوتا بلکہ بیچ میں ہوتا ہے۔ مگر ہر دو صورت میں نتیجہ ایک نکلتا ہے کہ مرتکب گناہ کبیرہ خوارج اور معتزلہ دونوں کے نزدیک خلود فی النار کا مستحق ہے، ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، کیونکہ ان دونوں فرقوں کے نزدیک مرتکب کبائر، ایمان سے خارج ہوتا ہے اور جو شخص ایمان سے نکل جاتا ہے وہ ہمیشہ جہنم کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ کبھی بھی جنت میں نہیں جائے گا۔ اہلِ سنت کہتے ہیں کہ ایمان کے دو درجے ہیں، ایک ہے ایمان منجی (وہ ایمان جو مطلقاً آگ سے نجات کا ذریعہ بن سکے، اس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اوّل وہلے میں انسان جنت میں جائے) جو خلود فی النار سے تو مانع ہے مگر دخول فی النار سے مانع نہیں، اور ایک ہے ایمان معلی (وہ ایمان جو جنت میں دخول اوّلی کا ذریعہ بنے) جو دخول فی النار سے بھی مانع ہے اور خلود فی النار سے بھی۔ گناہ گار مسلمانوں کا ایمان، ایمان منجی ہے، اس کے لیے شریعت کا عام قانون تو یہ ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی بقدر سزا کاٹ کر پھر ہمیشہ کے لیے جنت میں جائیں گے۔ ہاں اگر اللہ عفوودرگزر کا معاملہ کر کے سزا معاف کردیں اور انھیں شروع ہی میں جنت میں داخل کریں تو یہ ان کا اختیار ہے۔ یہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ کبائر کا مرتکب گناہوں کی وجہ سے اسلام سے نہیں نکلتا، اس کے گناہوں کی بقدر اسے سزا ملے گی، سزا بھگتنے کے بعد ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہو گا۔ یہی عقیدہ قرآن وسنت کے موافق ہے اور اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

درسِ حدیث

ابن عباس

﴿عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ وَلَا إِلَى أَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ إِلَى صَدْرِهِ﴾ (صحیح مسلم) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالی تمھارے جسموں کو نہیں دیکھتا اور نہ ہی تمھاری صورتوں کو دیکھتا ہے اور نہ ہی تمھارے مالوں کو دیکھتا ہے بلکہ وہ تمھارے دلوں اور تمھارے عملوں کو دیکھتا ہے“ اور ایسا فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

اللہ تعالی کے نظر نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمھارے جسموں، مالوں اور ظاہری صورتوں پر اللہ نظر اعتبار یعنی قدر وقیمت کا جانچنے کی نظر سے نہ دیکھے گا کیونکہ اس کی نگاہ میں جسموں کی مضبوطی اور ظاہری خوبصورتی کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے جب تک ان کے ساتھ حسن سیرت نہ ہو۔ اسی طرح اللہ کی نظر میں مال و دولت کی کوئی اہمیت نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ صدقات وانفاق اور اعمالِ صالحہ نہ ہوں۔ پس اللہ تعالی کی نظر میں اصل اہمیت تمھارے اعمال اور قلوب کی ہے۔ اور وہ دلوں کو دیکھتا ہے کہ تمھارے دل حالت صحت میں ہیں یا نہیں؟ دلوں میں ایمان ویقین کتنا ہے صدق وصفائی کا کیا حال ہے دلوں میں اچھے جذبات کی کیفیت کیا ہے۔ دل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سے لبریز ہیں یا نہیں۔ اور اللہ یہ دیکھتا ہے کہ کہیں دل بیمار تو نہیں یعنی کہیں دلوں میں شک وشبہات یا شہوات یا غیر اللہ کی محبت تو نہیں ہے۔ دلوں میں حسد، بغض یا ریا وغیرہ نے ڈیرے تو نہیں ڈال رکھے؟ پھر اللہ تمھارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے کہ یہ صالح ہیں یا نہیں۔ یہ اعمال خلوص واخلاص سے کیے گئے یا نہیں؟ تو اللہ تمھارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے اور اسی کے مطابق وہ تمھیں بدلہ دے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے تقوی اور خدا خوفی کا محل دل ہے جو سینے میں ہے ایک روایت میں اشارے کے ساتھ تین بار آپ نے یہ بھی فرمایا: ﴿التَّقْوَى هٰهُنَا﴾ تقوی یہاں ہوتا ہے، تقوی یہاں ہوتا ہے۔

نیکیوں میں جلدی کریں

ڈاکٹر محمد رشید ارشد

ہم اہل علم وصلاح سے یہ جملہ آئے روز سنتے رہتے ہیں کہ عصر موجود، دورِفتن ہے۔ اگر ہم اپنے اسلاف کی چار سوسال پرانی تصنیفات پڑھیں چاہے آٹھ سوسال پرانی، ہر جگہ ایک بات آپ کو مشترک لگے گی کہ زمانہ بہت خراب ہوگیا ہے، بہت فتنوں کا دور ہے اور جیسے قرب قیامت کی علامتیں ظاہر ہوگئی ہیں۔ آج کے لوگ اس بات کو مذاق اور تفنن کا ہدف بنالیتے ہیں کہ یہ عجیب سی بات ہے کہ اُن کو آٹھ سوسال پہلے فتنے اور آثار قیامت نظر آتے تھے اور آج بھی انھیں یہی کچھ سوجھ رہا ہے۔

کچھ اس میں تمسخر یا مذاق کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو عین دانشمندی کا تقاضا ہے کہ جس طرح ہمیں اپنی موت کو بہت دور خیال نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طریقے سے اس کائنات کی جو موت یا اجل ہے، جسے الساعۃ کہا گیا ہے اس کو بھی دور نہیں سمجھنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمومی ذوق یہی تھا۔ ایک موقعے پر نبی اکرم ﷺ نے دجال کا تذکرہ کیا۔ اس روایت میں الفاظ آتے ہیں: ﴿فَخَفَّضَ فِيهِ وَرَفَّعَ﴾ کبھی اپنی آواز کو پست کیا کبھی بلند کیا یا یہ مفہوم بھی لیا گیا ہے کہ کبھی اس کی ذات کو بہت حقیر اور کم تر دکھایا اور کبھی بہت مہیب الشان بتایا، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت پریشان ہوئے۔ حضور کریم ﷺ نے پوچھا یہ تمھاری کیا حالت ہو رہی ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ”یا رسول اللہ آپ نے دجال کے بارے میں جس انداز سے بیان کیا تو ہمیں لگا کہ کھجوروں کے جھنڈ سے ابھی دجال برآمد ہو جائے گا“۔ دیکھیں اس پر رسول اللہ ﷺ نے یوں نہ کہا کہ نہیں بھئی دجال کا ظہور تو ابھی بہت دور ہے۔ ابھی تو فلاں فلاں نشانیوں نے ظہور کرنا ہے، بلکہ فرمایا: ﴿إِنْ يَخْرُجْ وَأَنَا فِيكُمْ فَأَنَا حَجِيجُهُ دُونَكُمْ وَإِنْ يَخْرُجْ وَلَسْتُ فِيكُمْ فَامْرُؤٌ حَجِيجُ نَفْسِهِ﴾ (صحیح مسلم) ”اگر دجال میری موجودگی میں ظاہر ہو گیا تو میں تم سب کی طرف سے مقابلہ کروں گا اور اگر دجال میرے بعد نکلے تو ہر بندہ خود اپنا ذمے دار ہوگا“۔

توٹھیک بات یہ ہے کہ آدمی قیامت اور آثار قیامت کو قریب سمجھے اس کو دور خیال نہ کرے، بلکہ ڈرتا رہے۔ اسی طرح دوسروں کو ان نشانیوں اور فتن سے خبردار کرنا بھی درست طرز عمل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دجال ہی کے ضمن میں یہ فرمایا: ﴿إِنِّي أُنْذِرُكُمُوهُ وَمَا مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا وَقَدْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ﴾ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ) ''میں تمھیں اس سے ڈراتا ہوں اور ہر نبی اپنی قوم کو دجال سے ڈراتا رہا ہے''۔ تو معلوم ہوا کہ لوگوں کو ان نشانیوں کے ظہور سے ڈرانا شیوہ پیغمبری رہا ہے۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ ہم جس دور میں رہ رہے ہیں، وہ آسان دور نہیں ہے۔ ایمان اور عمل صالح کے تقاضے ادا کرنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب کی زندگیوں میں کچھ ایسی چیزیں داخل ہوچکی ہیں جو عمل صالح کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔

اس حوالے سے بطور مثال ایک دو چیزوں کو دیکھ ہی لیتے ہیں۔ اس دور میں تصویر (Image) کا جو فتنہ ہے، اس کی وجہ سے نظر کی حفاظت تقریبًا ناممکن ہوتی جارہی ہے اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ ایک بڑا فتنہ ہے۔ یہ انسان کی شخصیت میں بہت گہرائی میں جاکر سرایت کرتا ہے اور یہی اصل میں جنسی آوارگی کے فتنے کی جڑ اور بنیاد ہے۔ وہ جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نا کہ نگاہوں کا زنا بھی ہے، سماعت کا زنا بھی ہے، زبان کا زنا بھی ہے، تھامنے کا زنا بھی ہے، چلنے کا زنا بھی ہے تو ساکن و متحرک دونوں قسم کی تصویروں میں زنا کی مندرجہ بالا اقسام بے تکلف پائی جاتی ہیں۔ کیمرے کے ہر عام و خاص کے لیے مفت مہیا ہونے کی وجہ سے تصویر سازی نے اس طرح وبائی انداز اختیار کرلیا ہے کہ اس کی شناعت و کراہت ذہنوں سے محو ہوچکی ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کی وجہ اس دور میں اپنی عصمت وعفت اور پاک دامنی کے ساتھ زندگی گزارنا آسان نہیں ہے۔

دوسرا ایک فتنہ جو عموم بلویٰ اختیار کر چکا ہے وہ کسبِ مال کا فتنہ ہے سوال یہ ہے کہ ہم کھا کما کیسے رہے ہیں۔ معاملہ اب بہت سادہ نہیں رہا۔ آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے تک کچھ لوگ تھے جو حرام میں ملوث تھے۔ سود کا کاروبار کرتے یا رشوت لیتے تھے یا کوئی اور طرح کی ناجائز کمائی کی صورتیں تھیں، لیکن اب تو صورتِ حال ایسی ہوگئی ہے کہ ہم میں سے شاید ہی کوئی شخص یہ پوری طرح کہہ سکے کہ اس کی جو کمائی ہے وہ بالکل حلال و طیب اور پاک ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری دعائیں اللہ کی جناب میں قبول نہیں ہوتیں۔ وہ جو بہت ہی لرزا دینے والی حدیث ہے کہ

نبی اکرم ﷺ نے تذکرہ کیا ایک شخص کا کہ طویل سفر اس نے کیا ہے بال پراگندہ، کپڑے خاک آلود اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے پکارتا ہے... یارب... یارب! آپ دیکھیے دعا کی قبولیت کی جتنی بھی اضافی چیزیں ہیں وہ سب اسے حاصل ہیں، سفر میں دعا قبول ہوتی ہے تو وہ طویل سفر کر کے آیا ہے پھر پراگندگی کی حالت بجائے خود اللہ تعالیٰ کی رحمت کو متوجہ کرنے والی ہے۔ حج کے لباس "احرام" میں یہی پراگندگی اور درماندگی ہی تو ہوتی ہے۔ پھر اللہ کے آگے ہاتھ اٹھانا بجائے خود ایک بڑی بات ہے جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کو اس سے حیا آتی ہے کہ وہ بندوں کے پھیلے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے۔ اور کچھ روایات میں آتا ہے کہ جیسے وہ ملتزم کو تھامے ہوئے ہے کعبہ کے پردے کو تھامے ہوئے ہے اور پکار رہا ہے اے رب! اے رب! لیکن حالت کیا ہے: ﴿وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَلِكَ﴾ "اس کا کھایا حرام ہے، اس کا پیا حرام ہے، اس کا پہناوا حرام اور اس کا جسم جس غذا سے پلا بڑھا ہے وہ حرام ہے۔ تو اس کی کہاں سنی جائے"۔ سیدنا سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے یہ درخواست کی تھی کہ اے اللہ کے نبی ﷺ آپ دعا کیجیے کوئی نسخہ بتایئے کہ میں مستجاب الدعوات ہو جاؤں یعنی میری دعائیں اللہ کی جناب میں سنی جائیں۔ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ﴿أَطِبْ مَطْعَمَكَ تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَةِ﴾ "اپنے کھانے کو پاکیزہ بنالو تو تمھاری دعائیں سنی جائیں گی"۔ (مجمع الزوائد و منبع الفوائد)

تو ان دو اعتبار سے موجودہ زمانہ بہر حال آسان نہیں ہے۔ اپنی نگاہوں کی حفاظت کرنا، اپنی جنسی زندگی کو محفوظ رکھنا اور پھر اسی طریقے سے کسبِ حلال کرنا طیب کمائی کرنا مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا ہے یعنی دن بہ دن حالات ایسے بنتے جا رہے ہیں کہ لوگوں کو گویا حرام کھانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ تو اس طرح کے دور میں ہم سب کو اس کی ضرورت ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کو یاد دہانی کرواتے رہیں۔ قرآن مجید میں ہر مسلمان کے ذمے یہ کام لگایا گیا ہے کہ وہ تواصی بالحق (ایک دوسرے کو حق کی نصیحت و تلقین) کرتا رہے۔ اسی غرض سے یہ سطور پیش کی جا رہی ہیں۔

ہمیں دنیا میں بھیجا گیا تو ہم سے ایک ہی مطالبہ کیا گیا وہ یہ ہم خود کو پاکیزہ رکھیں۔ یہی ہماری کامیابی ہے کہ حالت پاکیزگی میں اللہ کی جناب میں پہنچیں تو پھر ہمارے وارے نیارے ہیں۔ سورہ الشعراء میں فرمایا گیا: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ

مَالٌ وَلَا بَنُونَ (88) إِلَّا مَنْ أَتَى اللهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (89) وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ (90)﴾ ''وہ قیامت کا دن جب نہ مال کام آئے گا نہ اولاد کوئی نفع دے گی سوائے اس شخص کے جو اللہ کے سامنے ایک جھکا ہوا فرمانبردار، صحیح سالم دل لے کر آتا ہے اور ایسے ہی متقی لوگوں کے نزدیک جنت لا کھڑی کی جائے گی''۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے فرمایا: ''دیکھو اللہ نے ایک دھیلا دے کے تمھیں آزمایا ہے اگر تم اس میں امین ثابت ہوئے تو تمھیں خزانہ بھی دیں گے''۔ وہ دھیلا کیا ہے وہ نورِ فطرت ہے جس پر ہمیں خلق کیا گیا ہے۔ اور ہماری آزمائش یہی ہے کہ اللہ نے جس فطرت پر ہمیں خلق کیا ہے ہم اس کو Pervert نہ ہونے دیں ہم اس میں آمیزش نہ ہونے دیں اور کوشش کریں کہ کم سے کم (آلودگی) Pollution کے ساتھ اللہ سے ملیں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ انسان دنیا میں رہے اور گناہوں سے بالکل پاک رہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک موقعے پر صحابہ کرام سے پوچھا: ''کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی شخص پانی پر چلے اور اس کے تلوے تر نہ ہوں؟'' انھوں نے عرض کیا: پانی پر چلنے سے پاؤں تر تو ہوں گے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿كَذَلِكَ صَاحِبُ الدُّنْيَا لَا يَسْلَمُ مِنَ الذُّنُوبِ﴾ (شعب الایمان) ''یہی معاملہ ہے صاحب دنیا کا کہ وہ گناہوں سے بالکل پاک نہیں ہو سکتا''۔ تو ہم سب آلودہ ہو جاتے ہیں ہم سب اپنے آپ کو خاک آلود کر لیتے ہیں تو ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے تزکیہ پر توجہ دیں اپنے آپ کو پاک کرنے کی ایک مسلسل کوشش میں لگے رہیں تاکہ پاک ہو کر جنت کے مکیں بن سکیں اس لیے کہ جنت پاکی اور ستھرائی کا مقام ہے تو تزکیہ یافتہ لوگ ہی وہاں داخل ہو سکیں گے: ﴿جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّى﴾ (طٰہٰ:۷۶) ''یہ باغات ہیں رہائشی، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بدلہ ہے اس کا جو پاک ہوا''۔ اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے: ﴿إِنَّهُ لاَ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلاَّ نَفْسٌ مُسْلِمَةٌ﴾ (صحیح بخاری) ''جنت میں داخل نہ ہو گا مگر بندہ فرمان بردار''۔ تو جو لوگ فرمانبرداری اور اپنا تزکیہ کر کے جنت کے مستحق بن گئے ان کے تو کیا کہنے مگر جو دوسرے ہیں جو خود کو گناہوں سے پاک نہ رکھ سکے لیکن ہیں وہ ایمان والے تو، آخرت میں ان کا تزکیہ کیا جائے گا!! لیکن آخرت کا تزکیہ بہت جاں گسل ہو گا، گناہوں کے میل کچیل کو جلانے کے لیے دوزخ کی بھٹیوں سے گزرنا پڑے گا۔ لوگ آگ سے جل کر چُرمُر ہو جائیں گے۔ پھر جب وہ گناہوں سے پاک ہو گئے تو اب اللہ تعالیٰ انھیں جنت کے لیے روانہ کریں

گے تو پہلے نہر حیات میں انھیں غسل دیا جائے گا: ﴿فَيُلْقَوْنَ فِي نَهْرِ الْحَيَاةِ، فَيَنْبُتُونَ كَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِي حَمِيلِ السَّيْلِ، أَلَمْ تَرَوْا أَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مُلْتَوِيَةً﴾ (متفق علیه) ''پھر انھیں نہر حیات میں ڈالا جائے گا وہ ایسے تر و تازہ ہو کر ابھریں گے جیسے نہر کے کنارے سبز چارہ گھنا ہو کر اگتا ہے''۔

البتہ بعض غارت گرِ ایمان ایسے بھی ہیں کہ جن کے مرتکبین کو یہ سخت ترین تزکیہ بھی نصیب نہ ہو گا۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں قرآن مجید میں جو بہت سخت ترین وعید اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اس میں یہی الفاظ آتے ہیں: ﴿لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (سورہ آلِ عمران:۷۷) ''اللہ تعالیٰ نہ ان سے کلام کریں گے نہ ان کی طرف نگاہ التفات کریں گے اور نہ ہی انھیں پاک کریں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔ تو جو نور فطرت ہمیں دیا گیا اس کی حفاظت کی کوشش کرنا یہی ہماری آزمائش ہے۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں نا قرآن مجید بتاتا ہے کہ اہل ایمان یہ دعا کرتے رہتے ہیں: ﴿رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا﴾ (التحریم:۸) ''اے ہمارے رب! ہمارے نور کو پورا کر دے اور ہماری مغفرت فرما''۔ یعنی ہم نے اپنی سی کوشش کی اپنی سی ہم نے جدوجہد کی ہے لیکن بہر حال ہم آلودہ ہو ہی گئے ہیں تو اے اللہ جو کمی رہ گئی ہے وہ تو پوری کر دیں۔ تو یہ ہماری ذمے داری ہے کہ ہم جب اللہ کی جناب میں حاضر ہوں تو ہم کم سے کم آلودہ ہوں۔ تو اس کے لیے استقامت درکار ہے۔ ایک صحابی سیدنا سفیان بن عبد اللہ الثقفی رضی اللہ عنہ، نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ اے اللہ کے نبی ﷺ: ﴿قُلْ لِي فِي الْإِسْلَامِ قَوْلًا لَا أَسْأَلُ عَنْهُ أَحَدًا بَعْدَكَ﴾ ''اللہ کے نبی آپ مجھے اسلام کی بابت کوئی ایسی بات ارشاد فرمایئے کہ آپ کے بعد مجھے کسی اور سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے'' یعنی کوئی جامع بات ارشاد فرما دیجیے کوئی ایسی بات کہ جس کو میں پلّے باندھ لوں اور وہ میرے لیے کافی ہو جائے اور مجھے کفایت کر جائے، تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ﴿آمَنْتُ بِاللهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ﴾ (شعب الایمان) ''تم یہ کہو میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر جم جاؤ اس پر ڈٹ جاؤ''۔ انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرے اور پھر اس پر جم جائے اور یہ ربوبیت کا اقرار تو ویسے ہم اس دنیا میں اپنی تخلیق سے پہلے کر آئے ہیں وہ جو عہد الست میں ہماری

ارواح سے پوچھا تھا اللہ تعالیٰ نے: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ''کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟'' تو ہم سب کی ارواح نے اس وقت یہ کہا تھا: ﴿بَلَى شَهِدْنَا﴾ ''کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں''۔ تو استقامت پر رہنا یہی مقام ولایت ہے: ﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (62) الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ(63)﴾(یونس) ''آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے نہ وہ غمگین ہوں گے وہ جو ایمان لائے اور تقوی پہ گامزن رہے''۔ تو اللہ پر ایمان لانا اور پھر اس ایمان کے تقاضے ادا کرنا یہی ہماری آزمائش ہے۔ اور کامیابی کسے کہتے ہیں یہ بھی قرآن مجید نے ہمیں واضح کر دیا: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾(آل عمران:۱۸۵) ''ہر نفس کو موت مزہ چکھنا ہے اور بے شک تمھیں قیامت کے دن تمھارا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا تو جس کو جہنم سے کھینچ کے دور کر دیا گیا، بچا لیا گیا، اور اس کو جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ شخص ہے جو کامیاب ہو گیا'' اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کامیابی سے نوازے۔ تو اصل کامیابی کیا ہے کہ ہم کوئی ایسی زندگی بسر کریں کہ جس میں ہم جب اللہ کی جناب میں حاضر ہوں تو وہاں کامیاب ہو جائیں۔ وہاں کامران ہو جائیں: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾(التغابن:۹) ''وہ دن کہ جس دن ہم تمام لوگوں کو جمع کریں گے وہ دن ہے تغابن کا دن''، اس دن معلوم ہو گا کہ کون غبن میں تھا کون ٹوٹے میں تھا، کون خسارے میں تھا اور کون کامیاب تھا تو فیصلہ جو ہے وہ آخرت میں ہونا ہے۔

اب اس کے لیے ہمیں کرنا کیا ہے اس کے لیے ہمیں یہ کرنا ہے کہ نیکی کی تقویٰ والی زندگی بسر کرنی ہے اور اس کو ٹالنا نہیں ہے اس میں دیر نہیں کرنی بلکہ جلدی کرنی ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ریاض الصالحین میں ایک باب (المبادرة إلى الخير) ''خیر کے کاموں میں جلدی کرنا'' باندھا ہے پورا اس عنوان سے اس Defer نہ کرنا جس طرح میں نے عرض کیا کہ ایک فتنے کا دور ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں اور ہر طرف Distraction ہے اور ہر طرف ہمیں اپنی طرف کشش کرنے والی چیزیں ہیں۔ تو ان حالات میں اگر ہم سستی کریں، اہم کاموں کو موخر کریں تو اس کا امکان ہے کہ ہم کوتاہی کا شکار ہو جائیں گے اور ہم اپنی منزل کھوٹی کر لیں گے۔ تو قرآن مجید ہمیں کیا کہتا ہے:

﴿فاستبقوا الخیرات﴾ ”کہ تم سبقت لے جاؤ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو خیر اور بھلائی کے کاموں میں“۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ﴾ (۱۳۳) ”سرعت کرو، جلدی کرو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان و زمین پر محیط ہے“ تو جلدی کرنا، دیر نہ کرنا، ویسے تو آپ کو معلوم ہے کہ عجلت کو پسند نہیں کیا گیا: ﴿الأَنَاةُ مِنَ اللهِ وَالعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ﴾ ”سوچ سمجھ کے دیکھ بھال کے معاملہ کرنا اللہ کی طرف سے ہے جلدی کرنا اور عجلت مچانا یہ شیطان کی طرف سے ہے“ لیکن جو دینی معاملات ہیں اس کو غیر ضروری طور پر ٹالتے رہنا اور وہ جو ایک بیماری ہوتی ہے جس کو Procrastination کہتے ہیں کل کرلیں گے پھر کل کرلیں گے پھر کل کرلیں گے تو جس کو تسویف کہتے ہیں سوف، سوف کہتے رہنا، جلد ہو جائے، عنقریب کر لیں گے۔ حسن البصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: إيَّاكَ والتسويف؛ فإنَّك بيومك ولست بغَدِك، فإنْ يكنْ لك غد، فكُنْ في غَدٍ كما كُنتَ في اليوم، وإنْ لم يكن لك غدٌ لم تندمْ على ما فرَّطت في اليوم ”سوف سوف کرنے سے بچو کیونکہ تم آج کے دن میں رہ رہے ہو یہ تمھاری کَل نہیں ہے اور اگر تمھاری کل آگئی تو تم آنے والی کَل کو بھی ایسے ہی ہوگے جیسے آج کے دن میں ہو اور اگر تمھاری کَل آہی نہ سکی تو نیکی میں کوتاہی پر تمھیں ندامت کے سوا کچھ نہ ملے گا“۔ کاموں کو کل پہ ٹالتے جانا، یہ وہ چیز ہے جو ہمیں خراب کرتی ہے۔ تو کہا گیا کہ بھائی سرعت کرو تیزی دکھاؤ اپنے رب کی مغفرت کی طرف، اس کا مطلب کیا ہے کہ ایک تو استغفار کے لیے جلدی کرو اللہ سے مغفرت طلب کرنے میں جلدی کرو اس میں دیر نہ کرو۔ آگے جو آیات آرہی ہیں اس میں بھی فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (۱۳۵) ”کہ وہ لوگ کہ جب ان سے کسی فحش کا ارتکاب ہوتا ہے یا اپنی جانوں پر ظلم ڈھا بیٹھتے ہیں، تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں، اور کون ہے گناہوں کو بخشنے والا سوائے اللہ کے، جو کچھ انھوں نے کیا ہے جو گناہ ان سے ہو گیا ہے وہ اس پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے“۔ اور نبی اکرم ﷺ نے تلقین بھی کی ہے ہمیں: ﴿بَادِرُوا بِالأَعْمَالِ

فِتنـًا كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِي كَافِرًا وَيُمْسِي مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا يَبِيعُ دِينَهُ بِعرْض من الدُّنْيَا﴾ (صحیح مُسلم) ''نیک اعمال میں جلدی کرو دیر نہ کرو کہیں ایسا نہ ہو کے ایسے فتنے آجائیں جو اندھیری رات کے ٹکڑوں کے مانند ہوں آدمی صبح کرے گا حالت ایمان میں اور شام ہوگی تو کافر ہوجائے گا اور شام کے وقت مؤمن ہوگا اور صبح ہوگی تو کافر ہوجائے گا، اور وہ اپنا دین بیچ دے گا دنیا کی پونجی کے عوض''۔ تو نیک کام جو ہم نے سوچ رکھا ہے کوئی خیر کا کام ہے کوئی انفاق کرنا ہے کوئی نفل پڑھنا ہے کوئی قرآن مجید کی تلاوت کرنی ہے جو بھی نیک کام ہم سوچتے ہیں اس میں جلدی کرنی چاہیے دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ هَرَمًا نَاغِصًا، وَمَوْتًا خَالِسًا، وَمَرَضًا حَابِسًا، وَتَسْوِيفًا مُؤْيِسًا﴾ (شعب الایمان) ''اعمال میں جلدی کرو شکستہ بڑھاپے کے آنے سے پہلے اور اچانک اچک لے جانے والی موت سے پہلے اور ڈھا دینے والے مرض اور مایوس کن تسویف کے نتیجے سے پہلے''۔

اور ایک طویل حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے بہت سے ایسے Factors کو جمع کردیا جو انسان کے لیے رکاوٹ بن سکتے ہیں نیکی کے کام میں خیر کے کام میں، آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿بَادِرُوا بِالأَعْمَالِ سَبْعًا هَلْ تَنْظُرُونَ إِلاَّ فَقْرًا مُنْسِيًا أَوْ غِنًى مُطْغِيًا أَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا أَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا أَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا أَوِ الدَّجَّالَ فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ أَوِ السَّاعَةَ فَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ﴾ (سنن ترمذی) اس حدیث مبارکہ کو اگر ہم اچھی طرح سمجھ لیں تو اس میں ہماری موعظت و نصیحت کا بہت سامان ہے۔

فرمایا: ﴿بَادِرُوا بِالأَعْمَالِ سَبْعًا﴾ ''سات چیزوں کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے پہلے نیک اعمال میں جلدی کرلو''۔ ﴿هَلْ تَنْظُرُونَ إِلاَّ فَقْرًا مُنْسِيًا﴾ ''تم انتظار کس بات کا کر رہے ہو، ایک ایسے فقر کا جو اللہ کی یاد ہی بھلا دے''۔ ابھی اللہ تعالیٰ نے کچھ مال دیا ہے کچھ تونگری دی ہے تمھاری ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں تو ابھی وقت ہے کہ اللہ کے لیے کچھ محنت کرلو، کچھ کوشش کرلو، کچھ Effort کرلو کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسا فقر تم پر آجائے جو اللہ ہی کو بھلا دے۔ وہ جو ایک ضرب المثل ہے نا عام طور حدیث کے طور پر مشہور ہے: ﴿كاد الفقر أن يكون

کفر اً﴾ ’’قریب ہے کہ فقر انسان کو کفر تک پہنچادے ‘‘۔ فقر میں یہ صلاحیت ہے کہ انسان اگر روٹی کے چکر میں پڑجائے اور صبح وشام ایک کردے دو وقت کی روٹی کے لیے تو اس کا بہت کم امکان ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے کوئی تعلق قائم کرے، اللہ سے لو لگائے۔ ایک فقر زہد اور استغنیٰ کے معنوں میں ہے لیکن فقر کا ایک معنی غربت اور تنگدستی ہے تو ان معنوں میں فقر کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی فقر سے پناہ مانگی ہے، لہٰذا یہ چیز اچھی نہیں ہوسکتی: ﴿اللَّهُمَّ إِن أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ﴾ (سنن نسائی) ’’ اے اللہ میں تجھ سے پناہ طلب کرتا ہوں کفر سے اور فقر سے ‘‘۔ تو ابھی اللہ نے کچھ مال دیا ہے کچھ کشائش دی ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم نیک کام کرلیں بھلائی کے کام کرلیں اس میں جلدی کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسی غربت ایسی تنگدستی آجائے جو اللہ کی یاد ہی کو بھلادے اور اس میں ہم اپنا معیار کوئی بہت بڑا نہ کریں کہ اتنا مال ہوگا ہمارے پاس تو تب ہم مالدار ہوں گے اور پھر خرچ کریں گے۔ نبی اکرم ﷺ کے اس قول کو سامنے رکھنا چاہیے: ﴿مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِنًا فِي سِرْبِهِ مُعَافًى فِي جَسَدِهِ عِنْدَهُ قُوتُ يَوْمِهِ فَكَأَنَّمَا حِيزَتْ لَهُ الدُّنْيَا﴾ (سنن ترمذی) ’’جو آدمی صبح کرے تم میں سے اس حال میں کہ وہ اپنے گھر بار میں امن سے ہو، اس کا جسد عافیت سے ہو اور اس کے پاس اِس دن کا کھانا موجود ہو تو گویا پوری دنیا اس پر انڈیل دی گئی ‘‘۔ تو اس کو غنیمت جانیں کہ اگر اللہ نے آج اتنی سہولت دے رکھی ہے کہ بنیادی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں تو کوشش کریں کہ کسی نیک کام میں اور کسی بھلائی میں مصروف ہوجائیں، کوئی دین سیکھنے کا کام ہے، دین کے لیے انفاق ہے، کوئی عبادات کا ارادہ کیا ہوا ہے کوئی حج وعمرہ کا قصد کیا ہے تو اس میں دیر نہ کریں کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی ایسا فقر آجائے جو اللہ کی یاد ہی بھلادے۔ ﴿أَوْ غِنًى مُطْغِيًا﴾ ’’یا تم ایسی تونگری اور مالداری کا انتظار کررہے ہو جو تمھیں سرکش بنادے‘‘ ۔ مال ودولت اور جاہ وجلال میں یہ صلاحیت ہے کے یہ انسان کو سرکش بنادیں۔ قرآن کریم میں وہ جو ایک خاص سرکش کردار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے تکبر وتمرد کا سبب یہی دو چیزیں بیان کی گئیں: ﴿أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ﴾ (سورۃ القلم: ۱۴) تو جب مال وبنین نے سرکش بنادیا تو اب حق کے بارے میں اس کا رویہ ملاحظہ کریں: ﴿إِذَا تُتْلَى عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾

(سورۃ القلم:۱۵) ’’جب اس پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو یہ کہتا ہے یہ تو اگلوں کے قصے ہیں‘‘۔ تو مال جب انسان کے پاس زیادہ ہو جائے تو یہ مال انسان کو سرکش کر دیتا ہے تو پھر وہ کہتا ہے: ﴿مَالِی مَالِی﴾ ’’میرا مال میرا مال‘‘، حالانکہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ تمھارا مال کون سا ہے، جو تم نے کھا لیا اور فنا کر دیا یا جو تم نے پہن لیا اور اس کو پہن کے بوسیدہ کر دیا یا جو تم نے صدقہ کر دیا اور اس کو آگے بھیج دیا باقی تمھارا مال ہے ہی نہیں وہ تو تمھارے وارثوں کا مال ہے۔ تو اس سے بھی ڈرنا چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مالداری آجائے، ایک دم اللہ تعالیٰ چھپڑ پھاڑ کے ایسا دے دیں کہ اس کے بعد انسان سرکش ہو جائے۔ تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم انتظار کر رہے ہو ایسی تونگری اور مالداری کا جو تمھیں سرکش بنا دے۔ ﴿أَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا﴾ ’’یا تم انتظار کر رہے ہو ایسی بیماری کا، ایسے مرض کا جو جسم کو فاسد کر دے جسم کو گلا سڑا دے‘‘۔ آج تم بھلے چنگے ہو تمھارے جسم و جان میں صلاحیت ہے تم کچھ کرنے کے قابل ہو تو کچھ کر لو کہیں ایسا نہ ہو کوئی تکلیف آجائے کوئی بیماری آجائے اور پھر تم کچھ کرنا چاہو تو نہ کر سکو جیسے لوگ عام طور پر کرتے ہیں کہ ٹالتے رہتے ہیں بھلائی کے کاموں کو، نیکی کے کاموں کو کہ بڑی عمر پڑی ہے بڑھاپے میں جا کر کریں گے تو کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کے تمھارا جسم ہی گل سڑ جائے اس کو کوئی ایسی بیماری لاحق ہو جائے کہ پھر تم وہ نیک عمل نہ کر سکو۔ تو کہا کہ مرض مفسد کے آنے سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ کی بندگی کے کام میں خیر کے کام میں جلدی کرو۔ اور پھر فرمایا: ﴿أَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا﴾ ’’یا تم انتظار کر رہے ہو ایسے بڑھاپے کا ایسی ادھیڑ عمری کا کہ جو تمھاری مت ہی مار دے عقل ہی تمھاری جاتی رہے‘‘۔ یہ جو لفظ ہے ﴿مُفَنِّدًا﴾ یہ وہ ہی لفظ ہے جو قرآن مجید میں سیدنا یعقوب علیہ السلام نے بولا تھا: ﴿إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ﴾ (۹۴) ’’میں یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ میری مت ماری گئی ہے یعنی مجھے سٹھیا ہوا نہ سمجھو‘‘۔ ﴿أَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا﴾ تو کیا تم انتظار کر رہے ہوں ایسے بڑھاپے کا ایسی ادھیڑ عمری کا کہ جو عقل کو ہی فارغ کر دے تم سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے جو ہی عاری ہو جاؤ۔ تو کر لو ابھی کام کر لو ابھی بھلے چنگے ہو، ابھی جوان ہو، ابھی صلاحیت ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسا بڑھاپا آجائے کہ تم کچھ کرنا بھی چاہو تو نہ کر سکو۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ اس نکمی عمر اور شکستہ

بڑھاپے سے پناہ مانگا کرتے تھے: ﴿أَعُوذُ بِكَ مِنْ أَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ ﴿وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَرَمِ﴾ (صحیح بخاری) ''اے اللہ میں تجھ سے پناہ طلب کرتا ہوں اس سے کہ تو مجھے نکمی عمر کی طرف لوٹا دے اور میں پناہ مانگتا ہوں عقل کو زائل کرنے والے بڑھاپے سے''۔ تو سمجھایا جا رہا ہے کہ ابھی جوان ہو ابھی تمھارے جسم و جان میں صلاحیت ہے تو جلدی سے نیک کام کرلو۔ ﴿أَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا﴾ ''یا تم انتظار کر رہے ہوں اس موت کا جو اچانک آجاتی ہے''۔ یعنی موت تو کبھی بھی آسکتی ہے وہ Ultimatum دے کر تو نہیں آتی لیکن بعض اوقات ایک ہوتا ہے کہ آدمی نے اپنی طبعی عمر پوری کرلی پھر بڑھاپا آیا یا یہ ہے کہ آدمی بیمار ہوا۔ بیماری کی کچھ Stages گزریں تو اس آدمی کو اندازہ ہے کہ موت قریب ہے تو آدمی توبہ تلافی کرلے کچھ اللہ سے عذر و معذرت کرلے کچھ لوگوں کے حقوق ادا کردے۔ لیکن ایک ایسی موت جو اچانک آجاتی ہے کوئی ایکسیڈنٹ میں ایک دم ختم ہو جائے یا بیٹھے بیٹھے Cardiac arrest ہو جائے آدمی کا دل بند ہو جائے۔ تو کہا کہ تم کیا ایسی موت کا انتظار کر رہے ہو جو اچانک آجاتی ہے۔ کوئی تنبیہ بھی نہیں کرتی تو کیا اس کا انتظار کر رہے ہو کہ مہلتِ عمر ختم ہو جائے۔ اور اس موقع پر بھی جس طرح قرآن مجید کہتا ہے نا کہ اس وقت کوئی شخص کہے: ''اے اللہ تو مجھے تھوڑی مہلت دے دیں اور تو مجھے دنیا میں لوٹا دے تو میں خوب صدقہ کروں گا اور خوب نیک ہو جاؤں گا''۔ لیکن ظاہر بات ہے: ﴿وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا﴾ (المنافقون:۱۱) ''جب کسی کی اجل آجائے تو اللہ تعالیٰ کسی کے وقت کو موخر نہیں کرتے''۔ تو کہا جا رہا ہے کہ کیا تم انتظار کر رہے ہو ایک ایسی موت کا جو اچانک آجاتی ہے۔ ﴿أَوِ الدَّجَّالَ فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ﴾ ''یا تم انتظار کر رہے ہو دجّال کا تو وہ غائب شدہ چیزوں میں سے کہ جن کا انتظار کیا جا رہا ہے سب سے بری چیز ہے''۔ دجال کے آنے کے بعد تم نیکی کرنے کی سوچ رہے ہو تو یہ بڑی بھول ہے وہ فتنہ تو تمھاری سوچ سے کہیں بڑا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ کچھ لوگ اس خیال سے کہ ہم سے اس سے نبٹ لیں گے، وہ حجت اور دلیل بازی کے ارادے سے اس کے پاس جائیں گے مگر اس کے شبہات کا شکار ہو جائیں گے۔ دیکھیں ابھی وہ شخص دجّال تو نہیں آیا ایک دجّالی فتنہ اور تہذیب ہے یا پھر دنیا پرستی کا فتنہ ہے جس میں ہم سب تھوڑے بہت ملوث ہیں لیکن

بہر حال ابھی تک اس شخص دجّال نے ظہور نہیں کیا جس کے بعد ایمان بچانا تقریبًا ناممکن ہو جائے گا۔ تو کہا کہ ''کیا تم دجّال کا انتظار کر رہے ہو تو وہ پوشیدہ چیزوں میں سے جن کا انتظار کیا جا رہا ہے سب سے بری مخلوق ہے''۔ دجال کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے: ﴿ثَلاثٌ إذا خَرَجْنَ لا يَنْفَعُ نَفْسًا إيمانُها لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ، أوْ كَسَبَتْ في إيمانِها خَيْرًا: طُلُوعُ الشَّمْسِ مِن مَغْرِبِها، والدَّجَّالُ، ودابَّةُ الأرْضِ﴾ (صحيح مسلم) '' تین چیزیں وہ ہیں جب ظاہر ہو جائیں تو ایمان نہ لانے والے کو ایمان لانا، یا ایمان میں نیکی نہ کرنے والے کو نیکی کرنے کا فائدہ نہ دے گا، سورج کا مغرب سے طلوع ہو جانا، دجال کا خروج کرنا اور دابۃ الارض کا ظاہر ہو جانا''۔ علی الاطلاق توبہ کا دروازہ تو سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد بند ہو گا جیسا کہ آگے آنے والی ایک حدیث میں بھی اس کی تصریح ملے گی اور اس کے بعد دابۃ الارض نکلے گا اور وہ نشان لگا کر نیک و بد کو الگ کر دے گا، تو اس وقت توبہ اور اصلاح احوال کا دروازہ بند ہو چکا ہو گا۔ البتہ ظہور دجال کے وقت توبہ کا دروازہ کھلا رہے گا، جبھی تو کثیر تعداد میں اہلِ کتاب عیسی علیہ السلام پر ایمان لائیں گے لیکن دجال کے ظہور کے بعد، حالات اتنے مشکل ہوں گے کہ پہلے سے ایمان و عمل صالح میں مصروف لوگوں کے قدم بھی اکھڑ رہے ہوں گے تو ان حالات میں جس شخص نے پہلے سے ایمان نہیں لایا ہو گا یا جس نے عمل صالح کے تقاضے ادا نہیں کیے ہوں گے تو اس کے لیے توبہ کرنا، اصلاح احوال اور ایمان کی محنت شروع کرنا بہت زیادہ مشکل ہو گا۔ اس مشکل کے بیان کے لیے، تغلیب کے قاعدے کے تحت دجال کا ذکر بھی یہاں کر دیا کہ دجال کے آنے کے بعد توبہ کا دروازہ بس بند ہی سمجھو اس سے پہلے پہلے جو کرنا ہے کر لو!! ﴿أَوِ السَّاعَةَ فَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ﴾ ''یا تم قیامت کا انتظار کر رہے ہو پس قیامت تو بڑی ہی سخت (مصیبت) اور بڑی ہی تلخ چیز ہے۔'' وہ قیامت جس کی صورتِ حال یہ ہے کہ اس وقت انسان بالکل باولا ہو کر پھرے گا: ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ () يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَى وَمَا هُمْ بِسُكَارَى وَلَكِنَّ عَذَابَ اللهِ شَدِيدٌ﴾ (سورۃ الحج: ۱،۲) ''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو

اللہ کا تقویٰ اختیار کرو بے شک قیامت کا بھونچال بہت بڑی چیز ہے۔ وہ دن کہ جس دن تم دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے شیر خوار سے غافل ہوجائے گی اور تم دیکھو گے کہ ہر حمل والی اپنا حمل گرادے گی۔ اور تم دیکھو گے کہ لوگ بالکل باولے ہوئے پھر رہے ہیں جیسے نشے میں مدہوش ہیں حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی بہت شدید ہے"۔

ماں (عورت) کے اندر جو سب سے بڑا جذبہ ہوتا ہے وہ ممتا کا جذبہ ہوتا ہے اور کوئی عفت والی عورت کبھی بھی اپنا حمل ضائع کرنا پسند نہیں کرتی لیکن قیامت کے حالات ان بنیادی جذبات سے بھی عورتوں کو غافل کردیں گے ۔ تو فرمایا کہ کیا تم اس الساعۃ کا انتظار کررہے ہو اور اس وقت کے لیے تم نے اپنی زندگی کے معمولات Refer کیے ہوئے ہیں تو جب نزع کا عالم طاری ہوجائے گا تو تمھارے لیے توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا: ﴿إِنَّ اللهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ﴾ (سنن ترمذی) "اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتے ہیں جب تک جان حلق میں نہ آکر اٹک جائے"۔ اسی طریقے سے اس کائنات کی جو موت اور نزع کا وقت ہے اس وقت کائناتی طور پر بھی توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا اور اس کائنات کی نزع سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے۔ اللہ کے نبی کریم ﷺ نے فرمایا : ﴿إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يَبْسُطُ يَدَهُ بِاللَّيْلِ لِيَتُوبَ مُسِيءُ النَّهَارِ وَيَبْسُطُ يَدَهُ بِالنَّهَارِ لِيَتُوبَ مُسِيءُ اللَّيْلِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا﴾ (صحیح مسلم) "اللہ تعالیٰ رات میں اپنے ہاتھ بڑھاتے ہیں تاکہ دن کا گناہگار توبہ کرلے اور دن میں ہاتھ بڑھاتے ہیں تاکہ رات کا گناہگار توبہ کرلے، یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہوجائے"۔ تو جب سورج مغرب سے طلوع ہوجائے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی نزع آگئی ہے اور اس کائنات کی نزع جب آجائے گی تو توبہ کا دروازہ اجتماعی طور پر بند ہوجائے گا۔ تو یہ سات چیزیں نبی اکرم ﷺ نے گن کر بتائی ہیں اور توجہ دلائی ہے کہ ان سات چیزوں کے آنے سے پہلے پہلے نیک عمل کرلو اللہ کو راضی کرنے والے اعمال کرلو۔ دوبارہ گن کے یاد کرلیں۔ پہلی چیز کیا ہے ﴿فَقْرًا مُنْسِيًا﴾ "ایک ایسی تنگدستی جو اللہ کو بھلادے"۔ ﴿أَوْ غِنًى مُطْغِيًا﴾ "یا ایسی تونگری جو سرکش بنادے": ﴿أَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا﴾ "یا ایسی

بیماری جو جسم کو فاسد کر دے'' ۔﴿أَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا﴾ ''یا ایسا بڑھاپا جو انسان کی عقل مار دے''۔﴿أَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا﴾ ''یا ایک ایسی موت جو اچانک آتی ہے''۔﴿أَوِ الدَّجَّالَ فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ﴾ ''یا دجّال کا انتظار کر رہے ہو کہ جو سب سے بری چیز ہے کہ جس کا انتظار کیا جا رہا ہے''۔ ﴿أَوِ السَّاعَةَ فَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ﴾ ''یا تم قیامت کے منتظر ہو اور وہ قیامت تو بہت سخت اور بہت کڑوی ہے''۔ تو ہم سب کو چاہیے کہ جو مہلت ہمارے پاس ہے جو وقت اللہ نے ہم کو دیا ہے اس کو قیمتی بنائیں۔ جو وقت ہمیں ملتا ہے کوشش کریں وہ اللہ کی یاد میں اس کو صرف کریں۔ بڑی خوبصورت حدیث ہے جامع ترمذی میں کہ نبی کریم ﷺ کی ملاقات جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی معراج کے موقعے پر، تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے نبی ﷺ سے فرمایا: ''اے محمد ﷺ اپنی امت کو میرا سلام کہیے اور ان کو میرا یہ پیغام پہنچادیں کہ جنت کی زمین بہت پاکیزہ ہے بہت Fertile ہے اور جنت کا پانی بہت میٹھا ہے لیکن اس کی زمین چٹیل ہے۔ اس میں کاشت کرنی ہے تو سبحان الله والحمد لله ولا إله إلا الله والله أكبر پڑھا کریں''۔ گویا ہم سب کو اپنی جنت خود کاشت کرنی ہے اور اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کی اہمیت کتنی زیادہ ہے اس زبان سے گویا ہم جنت اپنی خود کاشت کر رہے ہیں۔ اللہ کے نبی کریم ﷺ سے فرمایا: ﴿مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ غُرِسَتْ لَهُ نَخْلَةٌ فِي الْجَنَّةِ﴾ ''جس نے سبحان اللہ العظیم و بحمدہ کہا اس کے لیے جنت میں کھجور کا درخت لگادیا جاتا ہے''۔ اب یہ سادہ سی بات ہے لیکن یہی زبان ہے جس کی وجہ سے انسان جہنم کا ایندھن بھی جمع کرتا ہے۔ جب نبی اکرم ﷺ نے سیدنا معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنی زبان پکڑ کر فرمایا: ﴿كُفَّ عَلَيْكَ هَذَا﴾ ''اس کو تھام کر رکھو''۔ تو سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ اے اللہ کے نبی ﷺ کیا ہم زبان سے جو کلام کرتے ہیں اس پر بھی ہمارا مؤاخذہ ہوگا تو آپ نے فرمایا: ''انسان کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی سب سے بڑی چیز زبان کی کھیتیاں ہی تو ہیں''۔ تو اسی زبان سے ہم جہنم کے انگارے بھی جمع کر رہے ہیں اور اسی زبان سے ہم جنت کے درخت بھی لگا رہے ہیں۔ اور اس کی اہمیت یہ بھی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْعَبْدَ

لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللهِ لَا يُلْقِي لَهَا بَالًا يَرْفَعُ اللهُ بِهَا دَرَجَاتٍ وَإِنَّ الْعَبْدَ لِيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللهِ لَا يُلْقِي لَهَا بَالًا يَهْوِي بِهَا فِي جَهَنَّمَ﴾(صحیح بخاری)''بندہ اللہ کی رضا والا کوئی بول بولتا ہے اور اس کو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا، لیکن اللہ اس کے بدولت اس کے درجات بلند کر دیتا ہے اور کبھی انسان اللہ کو ناراض کرنے والا کوئی ایسا بول بولتا ہے جس کی خرابی کا اسے اندازہ نہیں ہوتا لیکن اس کی وجہ سے وہ جہنم میں جا پڑتا ہے''۔

تو زبان کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور جس طرح ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس دور میں ہمارے لیے جو بڑے بڑے فتنے ہیں ان میں ایک فتنہ نگاہ کی حفاظت کا ہے، اس کی حفاظت کا اہتمام کریں اور دوسرا زبان کا صحیح استعمال کریں۔ اللہ کے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:﴿مَنْ يَضْمَنْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضمنْ لَهُ الجنَّةَ﴾ (صحيح بخاری)''جو شخص مجھے ضمانت دے اس کی جو اس کے دونوں جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان) اور جو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے (یعنی شرمگاہ) تو میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں''۔

زبان میں دونوں ہی چیزیں آجائیں گی ایک تو وہ آفات اللسان ہے، جھوٹ ہے، غیبت ہے، بہتان ہے، گالم گلوچ ہے، تہمت لگانا ہے۔ اور دوسری انسان کی خوراک ہے یہی زبان ہے جو کھانے کے لیے استعمال ہوتی ہے انسان اگر خدانخواستہ حرام کھاتا ہے تو اسی زبان اور اسی منہ سے کھاتا ہے، تو اس لحاظ سے بھی شرمگاہ اور زبان ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق دیں کہ ہم اپنی حفاظت کریں اس دورِ فتن میں اپنی زبان، اپنی نگاہوں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کریں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

سوانح مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (۲)

حافظ حماد احمد ترک

علمی مقام و مرتبہ

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ علمی میدان میں جس طرح اکابر علماء کے دبستانوں سے مستفید ہوئے تھے اسی طرح ان علوم و فنون کو اپنے تلامذہ میں منتقل فرمایا۔ آپ رحمہ اللہ بلا شبہہ جامع العلوم والفنون تھے۔ آپ کے علمی مرتبے کی ایک جھلک حضرت تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہ کے رسالے ''میرے والد۔ میرے شیخ'' میں نظر آتی ہے۔ آپ رحمہ اللہ کے ذوق کی پہچان حضرت تقی صاحب مدظلہ سے زیادہ ہو بھی کس کو سکتی ہے، چنانچہ ذیل میں نقل ہونے والے اکثر واقعات موصوف محترم ہی کے رسالے سے ماخوذ ہیں:

علم تفسیر

آپ رحمہ اللہ کو علم تفسیر سے زیادہ مناسبت عمر کے آخری دور میں ہوئی۔ اگرچہ دارالعلوم دیوبند میں تفسیرِ جلالین اور بیضاوی پڑھانے کا شرف حاصل رہا، اور دورۂ تفسیر کے بعض اسباق اور تفسیر ابن کثیر بھی آپ رحمہ اللہ کے ذمے رہی لیکن شغف اس دور میں زیادہ تر فقہ و فتویٰ ہی سے رہا۔ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ''احکام القرآن'' آپ رحمہ اللہ کے سپرد فرمائی تو آپ کو تفسیر سے خصوصی شغف پیدا ہوا، پھر مسجد باب الاسلام کراچی میں روزانہ اور ریڈیو پر ہفتہ وار دروس قرآن دیتے رہے۔ آپ کو تلاوتِ قرآن کا خاص ذوق تھا، آخری عمر میں کئی کئی پارے تلاوت فرماتے، آپ رحمہ اللہ کے پاس ایک چھوٹا دستی بستہ موجود رہتا تھا۔ آپ رحمہ اللہ سفر و حضر میں، گھر میں یا کسی تقریب وغیرہ میں جب موقع ملتا اس بستے میں سے قرآن شریف نکال کر تلاوت شروع کردیتے، نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد خصوصیت سے تلاوت فرماتے تھے۔ دورانِ تلاوت تدبر بھی فرماتے، تلاوت کرتے کرتے اچانک رک جاتے اور کبھی اپنے گھر والوں کو ان حقائق و معارف سے آگاہ فرماتے جو دورانِ تلاوت آپ پر منکشف ہوتے تھے۔ آپ رحمہ اللہ کی تفسیر معارف القرآن بلاشبہہ انھی حقائق و معارف کا گنجینہ

ہے۔ معارف القرآن میں آپ نے دیگر تفسیری اقوال نقل کرنے کے بعد ایک مستقل سلسلہ معارف و مسائل تحریر فرمایا جس کے تحت ہر سورت میں مختلف آیات کے ذیل میں وہ معارف بیان فرمائے جو آپ پر اللہ تعالیٰ نے منکشف کیے۔ اس باب میں صرف ایک آیت کی تشریح علی سبیل المثال پیش ہے جو ہر ذی فہم کو "معارف القرآن" کی اہمیت سے آگاہ کرنے کے لیے کافی ہے: ﴿فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾ "تو کیوں نہ نکل پڑی ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرے اور اپنی قوم کے پاس واپس جا کر انھیں ڈرائے"۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ "نفر" استعمال فرمایا ہے۔ حالانکہ مفہوم لفظ "خرج" سے بھی ادا ہو سکتا تھا۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ "نَفَرَ مِنْهُ إِلَيْهِ" کے معنی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک شخص کسی چیز سے نفرت یا اعراض کر کے دوسری چیز کی طرف مکمل یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو۔ لہٰذا، اس لفظ سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ علم کی تحصیل صحیح طور پر اسی وقت ممکن ہے جب انسان ہر دوسری مصروفیت سے یکسو ہو کر پورے انہماک کے ساتھ علم کی تحصیل میں مشغول ہو جائے۔

اسی طرح آیت میں تحصیل علم کے لیے "لیتعلموا الدین" کے بجائے اللہ تعالیٰ نے ﴿لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اس میں پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ عربی زبان میں بابِ تفعل کی ایک خاصیت تکلف بھی ہے جس میں محنت و مشقت کا مفہوم بھی شامل ہے، اور اس سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ تحصیلِ علم کے لیے محنت و مشقت کی ضرورت ہے اور دوسرے اس بات کی وضاحت مقصود ہے کہ علمِ دین کی تحصیل میں مقصد محض علم برائے علم نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کا مقصد دین کا صحیح فہم اور سمجھ پیدا کرنا ہونا چاہیے۔ لہٰذا صرف کتابیں پڑھنے یا اصطلاحات یاد کر لینے سے علمِ دین کا مقصد پورا نہیں ہوتا، بلکہ ہر وہ طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے دین کا صحیح مزاج و مذاق اور اس کی سمجھ پیدا ہو۔ جس میں صحبت و تربیت بھی داخل ہے۔

آگے علمِ دین کی تحصیل کا مقصد دعوت و تبلیغ کو قرار دیا گیا ہے اور اس کے لیے قرآنِ کریم نے لفظ "انذار" استعمال فرمایا ہے۔ "انذار" کے لغوی معنی ہیں ڈرانا، لیکن یہ لفظ تخویف کے ہم معنی نہیں ہے، بلکہ "انذار" صرف اس

ڈرانے کو کہتے ہیں جس کا محرک مخاطب پر شفقت ہو۔ قرآنِ کریم نے بیشتر مقامات پر تبلیغ و دعوت کے لیے یہی لفظ اختیار فرمایا ہے جس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ تبلیغ و دعوت مخاطب کی ہمدردی، دلسوزی اور شفقت کے جذبات کے ساتھ ہونی چاہیے اور جس تبلیغ میں ان جذبات کے بجائے مخاطب پر غصہ، اس سے نفرت یا اس کی تحقیر کے جذبات شامل ہوں وہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب نہیں ہے۔

علمِ حدیث

علمِ حدیث آپ رحمہ اللہ نے حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ سے حاصل کیا جنھیں اپنے زمانے کا حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ آپ نے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ سے دورۂ حدیث بڑے ذوق و شوق اور اہتمام سے پڑھا اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تقریرِ بخاری اور تقریرِ ترمذی درس کے دوران ہی عربی زبان میں قلم بند فرمائی۔ حضرت شاہ صاحب کو بھی آپ سے بڑی محبت تھی۔ آپ نے ایک دفعہ زیادتی ثقہ کے مقبول ہونے کا ذکر کیا جس کے جواب میں شاہ صاحب نے مفصل تقریر فرمائی۔ اس کے بعد جب کبھی یہ مسئلہ زیرِ بحث آتا تو شاہ صاحب آپ کو مخاطب بناکر فرماتے: ''کہاں گیا وہ ثقہ کی زیادتی والا''۔ آپ رحمہ اللہ نے جن کتبِ حدیث کا درس دیا وہ یہ ہیں: مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، سننِ نسائی، طحاوی شریف، ابو داؤد، مشکوٰۃ شریف، شمائلِ ترمذی اور بخاری شریف۔ آپ کے درسِ حدیث کی خصوصیت یہ تھی کہ حدیث کے متن اور غرائب کی توضیح کے بعد فقہی امور ذکر فرماتے پھر اُس حدیث سے جو اخلاقی نتائج برآمد ہوتے ان کی بھی تلقین فرماتے۔ بطورِ مثال ایک روایت کی تشریح ملاحظہ ہو:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معروف حدیث صحاح میں موجود ہے کہ ﴿كان رسول الله ﷺ يسمر مع أبي بكر من أمور المسلمين و أنا معه﴾ ''رسول کریم ﷺ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے عشا کے بعد مسلمانوں کے کسی معاملے میں گفتگو فرمالیا کرتے تھے، اور میں بھی ان دونوں حضرات کے ساتھ ہوتا تھا'' ۔ اس حدیث کا اصل موضوع یہ بتانا ہے کہ اگر کوئی دینی ضرورت درپیش ہو تو عشا کے بعد گفتگو کرنا جائز ہے، چنانچہ یہ حدیث عموماً سمر بعد العشاء عشا کے بعد باتیں کرنے کے باب میں مذکور ہوتی ہے اور یہی مسئلہ اس میں زیرِ بحث آتا ہے، لیکن اس مسئلے کی

توضیح کے بعد حضرت مفتی اعظم قدس سرہ فرماتے: ”یہاں یہ بات بطورِ خاص دیکھنے کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یوں نہیں فرمایا کہ آنحضرت ﷺ مجھ سے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے گفتگو فرماتے تھے، بلکہ یہ فرمایا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے گفتگو فرماتے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس طرح حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ ادب سکھایا کہ جب کسی ایسے کام کا تذکرہ کرنا ہو جو تم نے اپنی کسی بڑے کے ساتھ مل کر کیا ہو تو یوں نہ کہو کہ یہ کام میں نے اور میرے فلاں بزرگ نے مل کر انجام دیا، کیونکہ اس میں دونوں کی برابری کا شبہہ ہوتا ہے، اس کے بجائے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ فلاں بزرگ نے یہ کام کیا اور میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ فرمایا کہ آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ذرا کسی کام سے کسی کا دامن چھو جائے تو اسے بلا شرکتِ غیرے اپنی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال یہ تھا کہ کوئی کام واقعتاً خود کیا ہو تو بھی اسے اپنے بجائے اپنے کسی بڑے کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش فرماتے تھے“۔

علمِ فقہ و فتویٰ

آپ رحمہ اللہ کو سب سے زیادہ مناسبت جس علم سے رہی وہ علمِ فقہ ہے۔ اسی بنیاد پر آپ رحمہ اللہ کا لقب ”مفتیٔ اعظم“ زبان زدِ عام ہوا۔ آپ رحمہ اللہ کی فقہ سے مناسبت اس وقت بہت بڑھ گئی جب آپ رحمہ اللہ کو دار العلوم دیوبند میں فتوے کی خدمت سونپی گئی۔ آپ رحمہ اللہ نے تقریباً ڈیڑھ لاکھ فتاویٰ تحریر فرمائے نیز فقہی تصانیف اور رسالے اس کے علاوہ ہیں۔ آپ رحمہ اللہ کے علمِ فقہ میں رسوخ کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

آپ رحمہ اللہ نے اوزانِ شرعیہ کے عنوان سے ایک رسالہ مرتب فرمایا جو محض **۳۲** صفحات کا ہے لیکن ان **۳۲** صفحات نے عہدِ حاضر کے اہلِ علم اور خاص طور پر اہلِ فتویٰ کے لیے جو سہولت میسر کر دی ہے وہ بسا اوقات ضخیم تصانیف سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس رسالے کا موضوع یہ ہے کہ شریعت میں بہت سے احکام کا مدار خاص اوزان اور پیمانوں پر ہے، لیکن عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہ میں اور اس کے بعد فقہاء کے زمانے میں جو اوزان اور پیمانے صاع، مد، اوقیہ، رطل وغیرہ کے نام سے رائج تھے، وہ آج کے پیمانوں سے یکسر مختلف تھے۔ ان پیمانوں کا موجودہ دور کے اوزان سے مقابلہ کر کے یہ بتانا ضروری تھا کہ صاع کتنے سیر کا ہوتا ہے اور موجودہ دور میں مد یا اوقیہ یا مثقال کا وزن کیا ہوگا؟ اگرچہ اس سے

پہلے بھی ہندوستان کے متعدّد فقہاء نے اس بارے میں اپنی اپنی تحقیقات مرتب فرمائی تھیں، لیکن ان تحقیقات میں اختلاف چلا آتا تھا، خاص طور پر فرنگی محل کے علماء کی رائے دوسرے اہلِ علم سے مختلف تھی اور اس کی بنیاد حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی قدس سرہ جیسے وسیع النظر عالم کے فتاویٰ پر تھی۔ اب اس اختلاف پر محاکمہ بڑا پیچیدہ اور مشکل کام تھا۔ آنحضرت قدس سرہ نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے انتہائی محنت اٹھائی، ایک ایک پیمانے کا خود وزن کیا۔ فقہاء نے درہم وغیرہ کا وزن جو کے دانوں سے مقرر کیا ہے اور اس کی خاص صفات تحریر کی ہیں، ان خاص صفات کے دانوں کو تلاش کر کے ان کا موجودہ اوزان کے ذریعے وزن کیا۔ اس کے لیے خود جنگل جا جا کر اصلی رتیاں توڑیں اور ان سے حساب لگایا، یہاں تک کہ اختلاف کا اصل منشا پالیا۔ اس رسالے کی تالیف میں آپ رحمہ اللہ نے فقہ، طب اور لغت کی نادر و نایاب کتب سے بھی مدد لی اور ہر ایک وزن اور پیمانے کا بذاتِ خود عملی تجربہ بھی کیا اور تحقیق و تدقیق کا یہ بار خود برداشت کر کے آنے والوں کے لیے مسئلے کو بالکل واضح کر گئے۔

اسی طرح فتویٰ دیتے وقت چاہے کتنا ہی واضح مسئلہ کیوں نہ ہو آپ رحمہ اللہ عموماً کئی کتب سے اس کی تصدیق فرماتے اور پھر فتویٰ دیتے۔ آپ رحمہ اللہ محض استفتا دیکھ کر جواب ارسال نہ فرماتے بلکہ اس سوال کے پس منظر کو دیکھتے اور اس فتوے کے کیا اثرات مرتب ہوں گے اس کی بھی رعایت کرتے، مثلاً: ایک مرتبہ سوال آیا کہ ”ہماری مسجد کے امام صاحب فلاں فلاں آداب کا خیال نہیں رکھتے، آیا انھیں ایسا کرنا چاہیے یا نہیں“؟ سوال کسی مقتدی کی طرف سے تھا جس کا منشا حق کی دعوت دینا نہیں بلکہ ان کی تحقیر اور ان کے خلافِ احتیاط امور کی تشہیر تھا، چنانچہ آپ رحمہ اللہ نے جواب تحریر فرمایا: ”یہ سوال تو خود امام صاحب کے پوچھنے کا ہے، ان سے کہیں کہ تحریراً یا زبانی معلوم کر لیں“۔ اسی طرح اگر عوام الناس کی طرف ایسا سوال موصول ہوتا جس کا بظاہر کوئی دینی و دنیاوی فائدہ نہ ہوتا، مثلاً: ”حضرت خضر زندہ ہیں یا نہیں، عرش افضل ہے یا روضۂ اقدس، حضرت یوسف علیہ السلام کا زلیخا سے نکاح ہوا تھا یا نہیں؟“ وغیرہ تو آپ رحمہ اللہ جواب میں یہ تحریر فرماتے: ”ان باتوں کے معلوم ہونے پر ایمان و عمل کا کوئی مسئلہ موقوف نہیں، اس میں وقت صَرف کرنے کے بجائے وہ کام کریں جو آخرت میں کام آئے“، اور کبھی محض یہ حدیث لکھ دیتے کہ ﴿من حسن إسلام المرء ترکه ما لا یعنیه﴾ ”انسان کے اچھا مسلمان بننے کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ وہ

لایعنی باتوں کو چھوڑ دے"۔

ایک صاحب نے سوال بھیجا: "یزید کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟" آپ رحمہ اللہ نے جواب تحریر فرمایا: "یزید سے پہلے اپنی مغفرت کی فکر کرنی چاہیے" ۔اسی طرح ایک صاحب نے سوال بھیجا: "فلاں صاحب ان امور کی وجہ سے فاسق ہوگئے یا نہیں؟" توآپ رحمہ اللہ نے جواب دیا: "مجھے ابھی تک اپنے فسق کی طرف اطمینان نہیں ہوا، میں کسی دوسرے کے بارے میں کیا فیصلہ کروں"۔آپ رحمہ اللہ کی عادت تھی کہ ہر کام میں مشورہ ضرور فرماتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ رحمہ اللہ کو مولانا تھانوی رحمہ اللہ کی یہ نصیحت یاد تھی جو آپ رحمہ اللہ نے دوسروں کو بھی تلقین فرمائی : "جب تک تمھارے ضابطے کے بڑے موجود ہوں ان سے استصواب کیے بغیر کوئی اہم کام نہ کرو اور جب ضابطے کے بڑے نہ رہیں تو اپنے معاصرین اور برابر کے لوگوں سے مشورہ کرو، اور جب وہ بھی نہ رہیں تو اپنے چھوٹوں سے مشورہ کرو"، ساتھ ہی حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا یہ قول بھی سناتے کہ "میں نے ضابطے کے بڑے اس لیے کہا کہ یہ بات تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کون بڑا ہے اور کون چھوٹا؟"۔

آپ رحمہ اللہ کی فقہ میں ممارست کا عالم یہ تھا کہ علامہ زاہد کوثری رحمہ اللہ ایک مکتوب میں آپ کے بارے میں لکھتے ہیں: " طویل تجربے نے آپ کو صحیح معنوں میں " فقیہ النفس " کے مقام تک پہنچا دیا ہے "۔فقیہ النفس فقہاء کے یہاں ایک عظیم مقام ہے جس کی وضاحت حضرت تقی صاحب مدظلہ نے ان الفاظ میں فرمائی: "فقیہ النفس فقہاء کی ایک اصطلاح ہے، اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فقہ میں کثرتِ ممارست کے بعد ایک ایسا ذوقِ سلیم عطا فرما دیا ہو جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بغیر بھی صحیح نتیجے پر پہنچ سکتا ہو"۔

معقولات

جس طرح آپ رحمہ اللہ کو منقولات پر دسترس تھی اسی طرح معقولات میں بھی درجۂ کمال حاصل تھا۔آپ رحمہ اللہ نے منطق، فلسفہ، کلام، ہیئت، ریاضی وغیرہ بھی پڑھائی، بلکہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا تھا کہ آپ رحمہ اللہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ میں معقولات کے ماہر کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ایک دفعہ دارالعلوم دیوبند کے ایک استاذ کو طلبہ نے "میر زاہد رسالے" کے درس میں سوالات کی بھرمار کرکے زِچ کر دیا، کبھی استاذ سوالات کے اطمینان

بخش جواب بھی نہ دے پاتے اور بحث و مباحثے کی نوبت آجاتی۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ درس آپ رحمہ اللہ کے ذمے لگایا، آپ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:" جب میں پہلے دن درس دینے کے لیے پہنچا تو میں نے طلبہ سے خطاب کرکے کہا، مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ حضرات کو معقولات میں بہت ملکہ ہے اور اس سلسلے میں آپ کے دل میں سوالات بہت پیدا ہوتے ہیں، اس لیے میں نے یہ طے کیا ہے کہ شروع میں ایک ہفتہ صرف سوال و جواب اور مذاکرے کے لیے رکھوں گا، اس ہفتے میں جس کسی کے دل میں کوئی سوال ہو وہ بلا تکلف بیان کردے اور جب تک اطمینان نہ ہوجائے، آگے نہ بڑھے، البتہ گفتگو کے دوران یہ بات ذہن میں رکھے کہ موضوعِ بحث معقولات ہیں لہٰذا گفتگو کی بنیاد خالص عقلی دلائل پر ہوگی اور محض اس بات کو دلیل نہیں سمجھا جائے گا کہ فلاں منطقی یا فلاں فلسفی نے یہ بات لکھی ہے بلکہ جو بات کہی جائے گی وہ عقلی دلائل کی بنیاد پر کہی جائے گی"۔ اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن میں نے جو قید لگادی تھی کہ کسی منطقی یا فلسفی کے قول کو حجت کے طور پر پیش نہ کیا جائے، اس کی بنا پر طلبہ کی ترکی جلد ہی تمام ہوگئی اور ایک ہفتہ تو درکنار، ایک دو دن ہی میں سارے سوالات ختم ہوگئے اس کے بعد میں نے حسبِ معمول درس شروع کیا اور بفضلہ تعالیٰ طلبہ مطمئن ہوگئے"۔

ادبی ذوق

آپ رحمہ اللہ کو زمانۂ طالبعلمی میں سب سے پہلے جس موضوع سے دلچسپی پیدا ہوئی وہ ادب تھا، آپ نے "نفحۃ الیمن" کی تعلیم کے دوران ہی عربی شعر کہنے شروع کردیے تھے۔ آپ نے تدریس کی ابتدا صرف و نحو سے کی، اسی دوران آپ نے "نفحۃ الیمن" پر حاشیہ بھی تحریر کیا۔ سالہا سال آپ نے "مقاماتِ حریری"، "دیوانِ متنبی"، "دیوان الحماسہ"، اور "سبع المعلقات" کا درس دیا۔ آپ کو عرب شعرا کے اتنے اشعار یاد تھے کہ سننے والے حیرت میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ آپ نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہے اور آپ کے بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر منجھے ہوئے اور مشاق شاعر کا گمان ہوتا ہے حالانکہ آپ نے کبھی شاعری کو مشغلہ نہیں بنایا، آپ کی ایک عربی غزل پڑھ کر یمن کا ایک شاعر اس قدر متاثر ہوا کہ آپ سے ملنے چلا آیا، اسی طرح آپ نے ایک دفعہ مولانا ماہر القادری کو اپنی فارسی غزلیں سنائیں تو وہ جھوم اٹھے، آپ کے اشعار میں شوخی و ظرافت اور بے ساختگی بھی ہے اور وعظ و نصیحت کا

سامان بھی، ایک طرحی مشاعرے میں آپ نے یہ غزل پڑھی جسے پڑھ کر بلا شبہہ کسی عربی شاعر کا گمان ہوتا ہے:

ترحّل عني الصبر يوم ترحّلوا
فبِتُّ بقلب في الحشا يتململُ
يقول نصيحي في هواه توجعًا
''تعزَّ فإن الصبر بالحُرِّ أجملُ''
يُصبِّرني؟ والصبر عين شكيّتى
وما غالني في الحب إلا التجمّلُ

(جس دن وہ مجھ سے رخصت ہوئے، اُسی دن مجھ سے صبر بھی رخصت ہوگیا، بس میں نے اس حال میں رات بسر کی کہ دل تڑپ تڑپ رہا تھا، میرا ناصح اپنے تئیں مجھے اِس تکلیف پر کہتا ہے کہ خاطر جمع رکھو کہ مردِ حُر کے لیے صبر ہی خوب ہے، وہ مجھے صبر کی تلقین کرتا ہے؟ جبکہ صبر ہی تو اپنا روگ ہے اور مجھے عشق میں ہلاک نہیں کیا مگر حسن نے)۔

نیز یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ بزم اب کہاں وہ طرب کا سماں کہاں
ساقی کہاں وہ جامِ مئے ارغواں کہاں
ڈھونڈیں ہم اب نقوشِ سبک رفتگاں کہاں
اب گردِ کارواں بھی نہیں کارواں کہاں

اور یہ اشعار:

لب پر دمِ اخیر ترا نام آگیا
رکتا ہوا یہ سانس بہت کام آگیا

بیمارِ عشق لے کے ترا نام سو گیا
مدت کے بے قرار کو آرام آگیا
آثار سارے صبحِ قیامت کے ہوگئے
محفل میں آج کون سرِ شام آگیا

پھر ان اشعار کی بے ساختگی دیکھیے:

اس قدر ہو گیا ہے خوگرِ غم
دل میں کوئی خوشی نہیں آتی
گدگدائے کوئی ہزار مگر
اب لبوں پر ہنسی نہیں آتی
تم بدلتے ہو روز قول و قرار
مجھ کو یہ دل لگی نہیں آتی
عمرِ رفتہ کا مرثیہ پڑھ لوں
اس سے بہتر حُدی نہیں آتی

اور ان اشعار کے تو کیا ہی کہنے:

رازِ ہستی جو پا گیا ہوں میں
سارے عالم پہ چھا گیا ہوں میں
حکَما جس کا راز پا نہ سکے
اس حقیقت کی ابتدا ہوں میں

میری ہستی کو سرسری مت جان
ڈور الجھی ہے اور سرا ہوں میں
آئینہ ہوں جمالِ مطلق کا
ایک جامِ جہاں نما ہوں میں

چند نصیحت آمیز اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ دنیا اے عزیزو ایک جھولے کی سواری ہے
اترنا اور چڑھنا سب کا اس میں باری باری ہے
یہاں کی ہر خوشی ہر غم، ہر اک آفت ہر اک راحت
بصیرت سے اگر دیکھو تو امرِ اعتباری ہے
حقیقت حق نے ہر اک آنکھ والے کو دکھا دی ہے
کسی کا غم کسی کے واسطے پیغامِ شادی ہے

اسی طرح یہ نظم ''مقبرے کی آواز'' بھی ہے جو انتہائی وعظ و نصیحت کا سامان ہے:

مقبرے میں اترنے والے سن
ٹھہر، ہم پر گذرنے والے سن
ہم بھی اک دن زمیں پہ چلتے تھے
باتوں باتوں میں ہم مچلتے تھے

اس نظم کا یہ ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے:

جن کو مر مر کے میں نے پالا تھا
جن کے گھر کا میں اک اجالا تھا

جن کے ہر کام کا مدار تھا میں
جن کی بگڑی کا سازگار تھا میں
دین و دنیا کی ساری مکروہات
جن کی خاطر تھی میرے سر دن رات
ہے کہاں آج وہ مری اولاد
جو نہیں کرتی بھول کر بھی یاد
جن پہ تھا کل مدار راحت کا
جس کو دعویٰ تھا کل محبت کا
جس کی الفت کا دل میں تھا اک داغ
کیا کسی گھر کا بن گئی وہ چراغ
آج وہ زینتِ حرم ہے کہاں
مہبطِ الفت و کرم ہے کہاں
کون آباد ہے مرے گھر میں
مِلک کس کی ہے نقد و زیور میں
کوئی کرتا نہیں ہے یاد مجھے
سب نے چھوڑا ہے نامراد مجھے

نظم کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے:

ہم ہر اک رہگزر کو تکتے ہیں
فاتحہ کے لیے ترستے ہیں

اے زمیں پر مچلنے والے دیکھ
کبر و نخوت سے چلنے والے دیکھ
وعظ ہے، قبر کا نشان میری
گرچہ خاموش ہے زبان میری
دل کے کانوں سے سن فغاں میری
درسِ عبرت ہے داستاں میری
جانے والے تو جا کے پھیلا دے
میری آواز سب کو پہنچا دے

آخر میں ایک مرثیے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو آپ نے مولانا محمد نعیم صاحب رحمہ اللہ کی وفات پر لکھے:

کون اٹھتا ہے آج عالم سے
پارہ پارہ ہے کیوں جگر غم سے
خون روتا ہے کیوں افق سرِشام؟
سینہ شق ہے یہ کس کے ماتم سے
حادثہ یہ کوئی عظیم نہ ہو!
یہ کہیں رحلت نعیمؔ نہ ہو!

ذوقِ مطالعہ

آپ کو کم سنی ہی سے مطالعے کا شوق تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں جب مدرسے میں کھانے اور آرام کا وقفہ ہوتا تو آپ کتب خانے کا رخ کرتے اور چونکہ یہ ناظمِ کتب خانہ کے بھی آرام کا وقت ہوتا تھا تو آپ نے اصرار کر کے انھیں اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ آپ کو کتب خانے میں چھوڑ کر باہر سے تالا لگا دیا کریں۔ آپ رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

”دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے کی کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو میری نظر سے نہ گزری ہو، اگر کسی کتاب کو پڑھا نہیں تو اس کی ورق گردانی ضرور کی تھی یہاں تک کہ جب علوم وفنون کی ساری الماریاں ختم ہوگئیں تو میں نے اُن الماریوں کا رخ کیا جنھیں کبھی کوئی شخص ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ یہ ”اشتات“ (متفرقات) کی الماریاں تھیں اور جن کتابوں کو کسی خاص علم وفن سے وابستہ کرنا ناظمِ کتب خانہ کو مشکل معلوم ہوتا تھا، وہ اِن الماریوں میں رکھ دی جاتی تھیں۔ یہ کتابیں چونکہ بے ترتیب تھیں اس لیے اِس جنگل میں داخل ہونا لوگ بے سود سمجھتے تھے کہ یہاں سے کوئی گوہرِ مطلوب حاصل کرنا تریاق از عراق سے کم نہ تھا، لیکن جب ساری الماریاں ختم ہوگئیں تو میں نے اشتات کے اس جنگل کو بھی کھنگالا اور اس کے نتیجے میں ایسی ایسی کتابوں تک میری رسائی ہوئی جو گوشۂ گمنامی میں ہونے کی بنا پر قابلِ استفادہ نہ رہی تھیں“۔ آپ رحمہ اللہ کو اس ساری محنت سے یہ معلوم ہوگیا کہ کون سی کتاب کہاں رکھی ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ اگر ناظم صاحب کسی کتاب کی تلاش سے مایوس ہوجاتے تو مجھ سے پوچھا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہ فرماتے ہیں: ” یوں تو آپ انتہائی کفایت شعار تھے لیکن کتابیں خریدنے کے معاملے میں کبھی انکار نہیں کیا۔ جس زمانے میں کراچی میں کوئی اچھا کتب خانہ نہیں تھا تب بھی آپ رحمہ اللہ کے پاس ذاتی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کو جب کبھی کسی مسئلے پر تحقیق کی ضرورت ہوتی تو وہ آپ کے مکان پر تشریف لے آتے“۔ آپ رحمہ اللہ کہیں جاتے اور کتنی ہی جلدی میں ہوتے لیکن کسی کتاب پر نظر پڑجاتی تو اسے دیکھے بغیر آگے نہ بڑھتے، آپ کی کتاب سے محبت کا یہ عالم تھا کہ کسی دوسرے ملک یا شہر جاتے اور وہاں کوئی نادر کتاب دیکھ لیتے تو اپنے قلم سے خود اس کی نقل کر لیتے اور ایسا متعدّد بار ہوا چنانچہ آپ کے ذخیرۂ کتب میں اب بھی کئی ایسی نادر کتب موجود ہیں جو عام طور پر نظر نہیں آتیں“۔

ذوقِ عبادت

اگرچہ آپ رحمہ اللہ کا پورا دن انتہائی مصروف گزرتا تھا، سیاست، انتظامی بکھیڑے، وعظ، تقریر و تدریس، تصنیف و تالیف، خدمتِ خلق وغیرہ غرض فجر سے لے کر رات گئے تک ان امور میں مشغول رہتے تھے؛ پھر بھی تہجد، اشراق، چاشت، اوابین، تلاوت، مناجاتِ مقبول اور دیگر اذکار کا معمول التزاماً پورا فرماتے تھے۔ حضرت تقی

صاحب مد ظلہ فرماتے ہیں: ’’نماز سے والد صاحب رحمہ اللہ کو خاص شغف تھا، اور جن لوگوں نے آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے انھیں یاد ہوگا کہ نماز کے دوران آپ پر عجز و نیاز، خشوع و خضوع اور خشیّت و انابت کی ایسی عجیب کیفیت طاری تھی جو شاذ و نادر کہیں دیکھنے میں آتی ہے‘‘۔ آپ نے خود ایک مکتوب میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے فرمایا: ’’آخرِ شب میں طولِ قیام اور طولِ سجود میں ایک خاص لذت پاتا ہوں اور جس رکن کو شروع کرتا ہوں، جب تک تھک نہ جاؤں اس سے منتقل ہونے کو جی نہیں چاہتا‘‘۔ حضرت تقی صاحب زید مجدہ فرماتے ہیں کہ: ’’ہم سے ایک دفعہ یہ جملہ سن کر ’’ذرا نماز سے فارغ ہو جائیں تو پھر وہ کام کریں گے ‘‘آپ رحمہ اللہ نے فرمایا: ’’ارے بھائی! نماز فارغ ہونے کی چیز نہیں ہے، اس سے فراغت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر نماز کی طرف متوجہ ہونا چاہیے‘‘۔ اسی طرح تلاوت کا بھی خوب اہتمام فرماتے تھے جس کا ذکر علم تفسیر کے تحت گزر چکا ہے۔

دعوت و تبلیغ

دعوت و تبلیغ کے متعلق آپ رحمہ اللہ نے کچھ اصول متعیّن کر رکھے تھے اور دوسروں کو بھی انھی کی تلقین کرتے تھے۔ آپ کے نزدیک دعوت میں سب سے اہمیت اس بات کو حاصل تھی کہ امت کی فکر ہو، آپ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل فرماتے تھے کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کو دعوت و تبلیغ کا ایسا تقاضا ہوتا تھا جیسا کھانے پینے کا، جس طرح ان چیزوں پر صبر نہیں کیا جا سکتا اسی طرح حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ بھی دعوت کے مواقع پر صبر نہیں کر سکتے تھے اسی لیے آپ کے وعظ میں خوب تاثیر ہوتی تھی۔

پھر داعی کو دعوت کی لگن ہونی چاہیے کہ لگاتار دعوت کے کام میں جُٹا رہے۔ اسی طرح مخاطب پر شفقت کرے اور حکمت کے ساتھ دعوت کا کام کرے۔ آپ فرمایا کرتے تھے: ’’جب داعیِ حق کے دل میں جذبہ، للّٰہیت اور لگن ہوتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر حکمت القا فرماتے ہیں اور اسے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون سی بات کہنے کے لیے کون سا موقع مناسب ہوگا‘‘۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ کسی فرقے کی تردید کرتے وقت طنز اور طعن و تشنیع کا انداز نہ اپنایا جائے۔ اس سے عام لوگوں کو تو فائدہ ہوتا ہے لیکن جس کا رد کیا جائے اس پر اثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر الہ آبادی کی نسبت علامہ اقبال

کے کلام کا اثر بہت وسیع ہے۔ داعی حق کے متعلق آپ فرماتے تھے کہ اسے نرم اور شفیق تو ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں کہ حق کو حق کہنے اور باطل کو باطل کہنے میں مداہنت برتے، داعی حق کی مثال آپ نے یوں دی کہ: ”داعی حق کی مثال ریشم جیسی ہونی چاہیے کہ اس کو چھو کر دیکھ تو اتنا نرم و ملائم کہ ہاتھوں کو حظ نصیب ہو لیکن اگر کوئی اسے توڑنا چاہے تو اتنا سخت کہ تیز دھار بھی اس پر پھسل کر رہ جائے“۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق آپ بہت حساس تھے، آپ نے اس فریضے میں بھی حدود کی خوب رعایت کی، فرماتے تھے: ”نکیر (ملامت) ہمیشہ منکَر پر ہونی چاہیے، اور غیر منکَر پر نکیر کرنا خود منکَر ہے۔ لہٰذا بعض لوگ جو مباحات پر یا محض آداب و مستحبات کے ترک پر نکیر کرنا شروع کر دیتے ہیں، اُن کا طرزِ عمل درست نہیں، آداب و مستحبات کی تعلیم و تبلیغ تو کرنی چاہیے، ان کی ترغیب بھی دینی چاہیے، اگر کوئی شخص کسی مستحب کو چھوڑ دے تو اسے تنہائی میں نرمی سے متوجہ کرنے میں بھی مضائقہ نہیں، لیکن اس پر نکیر و ملامت کسی طرح جائز نہیں“۔

انفاق فی سبیل اللہ

حضرت تقی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ آپ رحمہ اللہ کو انفاق کا بڑا ذوق تھا۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے مواقع ڈھونڈتے تھے۔ چنانچہ مصارفِ خیر کی جتنی صورتیں عام طور سے ہوتی ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو کہ جس میں آپ رحمہ اللہ نے خرچ نہ کیا ہو۔ آپ کا معمول تھا کہ جب کبھی رقم آتی تو اس میں سے مصارفِ خیر میں خرچ کے لیے کچھ رقم علیحدہ رکھ لیتے اور بوقت ضرورت اس میں سے انفاق کرتے، اسی مقصد سے آپ نے ایک تھیلا ”صدقات و مبرّات“ کا بنایا ہوا تھا۔ ایک دفعہ موٹر میں کہیں جا رہے تھے، موٹر رکی تو ایک سائل آیا، آپ نے اسے کچھ رقم دی تو حضرت تقی صاحب دامت برکاتہ نے سوال کیا: ” ایسے لوگ عموماً مستحق نہیں ہوتے، کیا انھیں دینا چاہیے؟ آپ نے فرمایا: ”ہاں میاں! بات تو ٹھیک ہے، لیکن یہ سوچو کہ اگر ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے استحقاق ہی کی بنیاد پر ملنے لگے تو ہمارا کیا بنے گا“؟

آپ رحمہ اللہ نے کبھی بھی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی منفعت کے ہاتھ سے نکل جانے پر حسرت نہ کی، ہمیشہ قناعت اختیار کی لیکن جو چیز آپ کے پاس موجود رہی کبھی اُس کی ناقدری بھی نہ کی۔ اگر کوئی چیز گم ہو جاتی تو اجمالی طور پر اُس کی تلاش ضرور کرتے چاہے ایک پائی ہی کیوں نہ ہو اور فرماتے کہ بڑی ناقدری کی بات ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی اس عطا سے خود کو مستغنی سمجھ کر اسے تلاش نہ کرے۔[1]

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ جب آپ دیوبند سے ہجرت فرما کر کراچی آئے تو آپ کے معاشی حالات انتہائی خراب تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ دیوبند سے چلتے وقت نقد رقم ساتھ لانا؛ ناممکن تھا چنانچہ آپ کے پاس اُس وقت جو نقد رقم تھی اُسے ایک سنار کو دے کر سونے کا ایک گلوبند بنوالیا تھا۔ کراچی میں جب حالات تنگ ہوئے تو آپ اُس گلوبند کو سنار کے پاس لے گئے کہ اُسے فرخت کردیں، سنار نے جب گلوبند کو کسوٹی پر پرکھا تو کہا کہ یہ تو سونا ہے ہی نہیں اور جس سنار سے یہ گلوبند بنوایا گیا تھا اُس نے دھوکہ کر کے شاید پیتل پر سنہری پالش کردی تھی اور اُس کو سونے کا گلوبند کہہ کر بیچ دیا تھا، گویا جو رہی سہی پونجی تھی وہ اس طرح مٹی ہوگئی۔ ایسے سخت حالات میں آخری سہارے کا چھن جانا قیامت سے کم نہیں، کوئی اور ہوتا تو نجانے کیا کچھ فریاد کرتا لیکن حضرت تقی صاحب زید مجدہ فرماتے ہیں کہ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ اس واقعے کا ہنس ہنس کر ذکر فرمایا کرتے تھے۔

اسی طرح آپ رحمہ اللہ کے کئی سرکاری عہدے داروں سے مراسم تھے لیکن اُن سے مالی منفعت کا تعلق کبھی نہ رکھا، نہ ہی اُن کے پاس آنے جانے کا معمول تھا بلکہ کسی مدرسے کی تقریب میں ایک سرکاری شخصیت نے بھی آنا تھا، چنانچہ جب وہ صاحب آئے تو آپ مدرسے کے ایک کمرے میں جاکر سوگئے تاکہ اُن سے سامنا نہ ہو، بلاشبہہ آپ کی تربیت حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کا بڑا حصہ تھا کیونکہ حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے تھے: ”جی چاہتا ہے کہ علماء میں دو چیزیں بالکل نہ ہوں: ایک کبر اور ایک طمع، ان کی وجہ سے یہ بڑی دولت سے محروم رہتے ہیں۔ علماء کو امرا سے استغنا چاہیے، یہ لوگ ملانوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اس حقیر سمجھنے کا زیادہ سبب یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ طامع ہوتے ہیں۔ اس سے علم اور اہلِ علم کی تحقیر ان کے دل میں مرکوز ہو جاتی ہے، علماء کو ہر وقت اس آیۂ قرآنی کا مراقبہ رکھنا

چاہیے: ﴿وَلِلَّـهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ میں استغنا تو کیا، ذرا؛ استغنا کی نقل کرتا ہوں مگر کم فہم لوگ مجھ کو ملامت کرتے ہیں کہ سخت ہے، میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میں سخت نہیں ہوں ہاں قلب میں غیرت ضرور ہے۔[2]

تصانیف

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کی تصانیف کی کل تعداد ۱۶۲ ہے جن کا ذکر مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہ نے یوں فرمایا ہے:

تفسیر

(۱) تفسیر معارف القرآن (۲) احکام القرآن (عربی) از سورۂ شعراء تا سورۂ حجرات۔

حدیث

(۳) تقریرِ ترمذی جو حضرت انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے درس میں قلمبند فرمائی (غیر مطبوعہ) (۴) الازدیاد السني علی الیانع الجني (عربی) اکابر علمائے دیوبند کا سلسلۂ اسنادِ حدیث (۵) مختصر چہلِ حدیث مترجم متعلقہ اخلاق و آداب (۶) چہلِ حدیث متعلقہ اسلامی معاشیات (غیر مطبوعہ) (۷) چرخے کی فضیلت: متعلقہ احادیث کا مجموعہ۔

فقہ

(۸) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (امداد المفتین) (۹) اسلام کا نظام اراضی (۱۰) آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام (۱۱) مسئلۂ سود (۱۲) آداب المساجد (۱۳) رفیقِ سفر، سفر سے متعلق شرعی احکام و آداب (۱۴) مسجد کے حدودِ کار اور آداب، یہ رسالہ مستقل تصنیف فرمایا تھا، بعد میں اسے معارف القرآن کا جز بنا دیا (۱۵) شبِ براءت (۱۶) احکام القمار (۱۷) تصویر کے شرعی احکام (۱۸) بیمہ زندگی (۱۹) حیلۂ ناجزہ، یہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور والدِ ماجد کی مشترک تصنیف ہے (۲۰) نکاح طلاق، یہ بھی آپ نے بعد میں معارف القرآن کا جز بنا دیا (۲۱) اعضائے انسانی کی پیوند کاری (۲۲) پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود (۲۳) ضبطِ ولادت کی شرعی حیثیت (۲۴) احکامِ حج (۲۵) قرآن میں نظامِ زکوٰۃ (۲۶) احکامِ دعا (۲۷ تا ۷۱) جواہر الفقہ، یہ آپ کے پینتالیس فقہی رسائل پر مشتمل ہے (۲۷ تا ۸۹) وہ اٹھارہ رسائل جو

فتاویٰ دارالعلوم ''امداد المفتین'' کا جز بن کر شائع ہو رہے ہیں (۹۰ تا ۹۶) وہ سات فقہی رسائل جو عربی زبان میں احکام القرآن کا جز بن کر شائع ہو چکے ہیں۔

عقائد و کلام

(۹۷) ایمان و کفر قرآن کی روشنی میں (۹۸) مقامِ صحابہ رضی اللہ عنہم (۹۹) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں افضل کون ہے؟ (۱۰۰) ختمِ نبوت کامل (۱۰۱) التصریح بما تواتر في نزول المسیح (عربی) یہ کتاب حضرت مولانا سید انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ اور والد ماجد (مفتی اعظم) رحمہ اللہ کی مشترکہ تالیف ہے (۱۰۲) هدیة المهدیین في آیات خاتم النبیین (عربی) (۱۰۳) مسیحِ موعود کی پہچان (۱۰۴) دعاوی مرزا (۱۰۵) ممالکِ اسلامیہ سے قادیانیوں کی غداری (۱۰۶) مشرقی اور اسلام (۱۰۷) سنت و بدعت۔

معیشت و سیاست

(۱۰۸) اسلام کا نظامِ تقسیم دولت (۱۰۹) اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہوں گی؟ (۱۱۰) دستورِ قرآنی (۱۱۱) اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق (۱۱۲) ووٹ اور ووٹر کی شرعی حیثیت (۱۱۳) سرمایا داری، سوشلزم اور اسلام (۱۱۴) خطبۂ صدارت کل ہند جمعیتِ علمائے اسلام کانفرنس منعقدہ حیدر آباد، سندھ، جنوری ۱۹۴۷ء (۱۱۵) افاداتِ اشرفیہ در مسائلِ سیاسیہ (۱۱۶) جہادِ پاکستان ۱۹۶۵ء (۱۱۷) حالیہ جنگ نے ہمیں کیا سبق دیے؟ (۱۱۸) وحدتِ امت (۱۱۹) أخلاق أم شقاق؟ (عربی) (۱۲۰) اسلام میں مشورے کی اہمیت (نامکمل)۔

سیرت و تاریخ

(۱۲۱) سیرتِ خاتم الانبیاء (آداب النبی صلی اللہ علیہ وسلم) (۱۲۳) شہادتِ کائنات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادتیں کائنات میں (۱۲۴) فتوح الہند (۱۲۵) شہیدِ کربلا (۱۲۶) ذوالنون مصری (۱۲۷) دو شہید (۱۲۸) درسِ عبرت۔

اصلاح وارشاد

(۱۲۹) گناہِ بے لذت (۱۳۰) گناہوں کا کفارہ (۱۳۱) بسم اللہ کے فضائل و مسائل (۱۳۲) روحِ تصوف (۱۳۳) دافعُ الإفلاس (۱۳۴) مصیبت کے بعد راحت (۱۳۵) كيد الشيطان، موت کے وقت مکرِ شیطانی اور بچاؤ کی تدبیریں (۱۳۶) رجوع إلى الله (۱۳۷) ذکر اللہ اور درود و سلام کے فضائل (۱۳۸) آداب الشيخ والمريد (۱۳۹) خلاصہ وتسہیل قصد السبیل (۱۴۰) دل کی دنیا (۱۴۱) ملفوظات امام مالک رحمہ اللہ (۱۴۲) ملفوظات امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (۱۴۳) پیغمبر امن و سلامت ﷺ (۱۴۴) مقدمہ حیاۃ المسلمین۔

تعلیم وتبلیغ

(۱۴۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، یہ کتاب ماہنامہ "القاسم" دیوبند میں قسط وار شائع ہوئی (۱۴۶) قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم (۱۴۷) طلبہ کے نام دو اہم پیغام (۱۴۸) وصیت نامہ۔

زبان وادب

(۱۴۹) أصول اللغة، مقدمہ المنجد اردو (۱۵۰) کشکول، اردو فارسی کلام، نظم و نثر (۱۵۱) نفحات، عربی نظم و نثر کا مجموعہ (۱۵۲) تحفة الوطن شرح نفحة اليمن (عربی)۔

متفرقات

(۱۵۳) اسلام میں نظامِ مساجد (۱۵۴) میرے والدِ ماجد اور ان کے مجرب عملیات (۱۵۵) نقوش و تاثرات۔ سفرنامہ دیوبند و تھانہ بھون (۱۵۶) مجالسِ حکیم الامت (۱۵۷) حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے آخری عمر کے ملفوظات جو خاتمة السوانح میں شائع ہوئے (۱۵۸) مکاتیبِ حکیم الامت (غیر مطبوعہ) (۱۵۹) دار العلوم دیوبند اور اس کا مزاج و مذاق (۱۶۰) تاریخِ قربانی (۱۶۱) مقدمہ امداد الفتاویٰ (۱۶۲) مقدمہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند (عزیز الفتاویٰ)۔[3]

وفات

آپ رحمہ اللہ کی وفات ۱۱ شوال ۱۳۹۶ھ بمطابق ۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو کراچی میں ہوئی،[4] آپ کی نمازِ جنازہ حکیم الامت رحمہ اللہ کے خلیفہ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی رحمہ اللہ نے پڑھائی اور دارالعلوم میں ہی آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔[5] آپ کی وفات پر متعدّد علمائے کرام نے آپ کی دینی خدمات پر آپ کو خراجِ تحسین پیش کیا جن میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا قاری محمد طیب صاحب، علامہ یوسف بنوری صاحب، ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحب، مولانا منظور نعمانی صاحب، مولانا سرفراز خان صفدر صاحب، مولانا سلیم اللہ خان صاحب، مولانا یوسف لدھیانوی صاحب، مولانا سحبان محمود صاحب، مولانا عاشق الٰہی صاحب، شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان صاحب، مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب، شامل تھے۔ بہت سے علمائے کرام رحمہم اللہ نے تعزیتی کلمات شائع کیے۔ مشہور شاعر اور ادیب جناب رئیسؔ امروہوی نے بھی ایک قطعہ کہا جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

فقیہ و شارحِ قرآن و مفتیٔ اعظم
وہ جس کی ذات میں تھیں جلوہ گر تمام صفات
وہ "البلاغ" کا داعی وہ دعوت تبلیغ
رئیسؔ آئینۂ علم وفضل جس کی ذات[6]

لیکن اس موقعے پر شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے اپنے جذبات کا اظہار سب سے موئثر انداز میں کیا، ملاحظہ ہو:

کیوں تیرہ و تاریک ہے نظروں میں جہاں آج
کیوں چھائے ہیں ہر سمت یہ ظلمت کے نشاں آج
کیا نخلِ تمنا کو مرے آگ لگی ہے؟
رہ رہ کے یہ سینے سے جو اٹھتا ہے دھواں آج
رفتارِ تنفس ہے کہ چلتے ہوئے آرے؟
کیوں جرعۂ زہراب ہے یہ شربتِ جاں آج

کیا حضرت والد کو قضا لے کے چلی ہے؟
اک قافلۂ نور ہے گردوں پہ رواں آج
ابا مرے جنت کے بسانے کو چلے ہیں
اے موت! ترا مرتبہ پہنچا ہے کہاں آج
یوں برق و شرر نے مرا پھونکا ہے نشیمن
باقی ہے کوئی شاخ، نہ تنکوں کا نشاں آج
اب زیست کا ہر مرحلہ نظروں میں کٹھن ہے
گردابِ بلا خیز ہے یہ نہرِ رواں آج
دل میں وہ تلاطم ہے کہ ہلچل سی مچی ہے
اور آنکھ ہے ظالم! کہ بس اک خشک کنواں آج
وہ والدِ مشفق، وہ مرے شیخِ مربی
کس دیس کی بستی میں ہیں آرام کناں آج
وہ چہرۂ پر نور کی تابندہ ضیائیں
صد حیف! کہ ہیں خاک کے تودے میں نہاں آج
وہ پھول چنا میرے گلستاں سے اجل نے
جس پھول کی خوشبو سے معطر ہے جہاں آج
وہ اسوۂ اسلاف کی رخشندہ علامت
اے خاک بتا! تو نے چھپائی ہے کہاں آج

وہ عظمتِ اسلام کا تابندہ ستارہ
توصیف سے جس کی مری عاجز ہے زباں آج
وہ مشعلِ ایمان، کہ بھٹکے ہوئے راہی
پاتے ہیں جسے دیکھ کے منزل کا نشاں آج
وہ معرفت و علم کا مہتابِ فروزاں
ہے چشمِ فلک! کون سی بدلی میں نہاں آج
وہ گنجِ گراں مایہ علومِ نبوی کا
عالم میں اسی فیض کے دریا ہیں رواں آج
وہ مفتیٔ اعظم، وہ معارف کا خزینہ
وہ جس کے فتاویٰ سے منور ہے جہاں آج
کس شان سے قرآں کے بکھیرے ہیں معارف
دنیا ہے کہ اک سلسلۂ کاہکشاں آج
وہ اشرف و محمود کا اک ذکر سراپا
وہ انور و شبیر کا انداز بیاں آج
وہ بے کس و مظلوم کی آہوں کا سہارا
کیا ہو گیا وہ مرہمِ افسردہ دلاں آج
یہ مسندِ افتا ہے کہ ویران پڑی ہے
ہے دینی مدارس میں بس اک ہو کا سماں آج

اب کون بنے داروے غم ہاے زمانہ؟
کس کو ہے مسلماں کا غمِ سود و زیاں آج
اب کون ہے دنیا میں جو پوچھے گا تقی کو
کس فکر میں ہے، کیوں نہیں آیا، ہے کہاں آج[7]

علامتِ اہلِ حق

ان سطور کی تیاری میں حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کی سوانح پڑھنے کے ساتھ دیگر علماء کی حیاتِ مبارکہ کے مطالعے کی سعادت بھی نصیب ہوئی، اس مطالعے سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اور جس نکتے کو حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ نے اپنے ایک رسالے میں بھی درج کیا وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس بیٹھنے سے اسلاف اور بزرگانِ دین کی محبت پیدا ہوتی ہو، ائمۂ امت سے تعلق بڑھتا ہو، وہی اہلِ حق ہیں، اور جن کی مجالست سے اسلاف سے دوری اور علمائے حق سے بغض پیدا ہوتا ہو، ان سے اجتناب ہی میں خیر ہے، کیونکہ اگر یہ دولت چلی گئی تو گویا پورا دین ہی چلا گیا، پس ایسے لوگوں سے میل جول ختم کر دینا ہی مفید ہے جو دینی روایت سے کاٹیں اور اہل اللہ سے دور کریں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ ایک جملہ بکثرت فرماتے تھے کہ "طرق الوصول إلى الله بعدد أنفس الخلائق" یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے اس قدر کثیر ہیں کہ جتنی مخلوقِ خدا کی سانسیں، اکابر کی سیرت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اہل اللہ کی صحبت معرفتِ الٰہی کے حصول کا موثر ترین ذریعہ ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ یہ صحبت ہی کل دین ہے تو بے جا نہ ہو گا، صحابہ رضی اللہ عنہم کا درجہ اگر سب سے بلند ہے تو اسی صحبت سے ہے جیسے ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو اپنے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی صحبت کے لیے منتخب فرمایا، اسی صحبت نے ان حضرات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، بقولِ شاعر:

خود نہ تھے جو راہ پہ اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

اور اسی حقیقت کو اکبر الہ آبادی نے یوں بیان کیا:

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اللہ تعالیٰ ہمیں اہلِ حق کی صحبت میسر فرمائے اور علمائے اہلِ حق کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین!

حوالہ جات

[1] میرے والد۔ میرے شیخ، مفتی محمد تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن، جنوری ۲۰۰۹ء،
ص:۸۵-۹۲/۷۷-۸۱/۴۰-۷۱/۳۵-۳۶/۱۶-۳۳/۱۲-۱۴/۹۵-۱۵۵

[2] ماہنامہ البلاغ، جمادی الثانیۃ ۱۴۳۹ھ، ص:۱۳

[3] حیاتِ مفتی اعظم رحمہ اللہ، مفتی محمد رفیع عثمانی، ادارۃ المعارف کراچی، مئی ۲۰۰۵ء، ص:۱۷۱

[4] ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم رحمہ اللہ نمبر، ص:۳۱

[5] //aalmiakhbar.com/archives/4224

[6] ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم رحمہ اللہ نمبر، ص:۱۲۲۴

[7] ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم رحمہ اللہ نمبر، ص:۱۳

تفقہ فی الدین (۲)

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

فرضیت علم وفقہ

مضمون کے پہلے حصے میں ہم نے تفقہ فی الدین یا علم دین کے تین شعبے معلوم کیے تھے یعنی علم العقیدہ یا علم الکلام، علم الاحکام یا فقہ اور علم الاخلاق یا تصوف، یہ تقسیم نوعیت کے اعتبار سے تھی۔ اب ہم فرضیت کی طرف آتے ہیں تو علم دین کی ان تینوں انواع کا علم حاصل کرنا فرض ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تین انواع کا کتنا علم حاصل کرنا فرض ہے۔ زمین اور بارش کی مثال پر مشتمل حدیث اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ بھی علم دین یا فقہ فی الدین کی دو اقسام بیان کرتی ہے لیکن یہ تقسیم مکلفین کے اعتبار سے ہے یعنی یہ تقسیم بہ اعتبار فرضیت ہے۔ اس حدیث کی رو سے علم کی دو اقسام ہیں: ایک وہ جو اپنی ذات کے فائدے کے لیے ضروری ہے، جو خود دین پر عمل پیرا ہونے کی حد تک علم حاصل کرنا ہے۔ دوسرا وہ جو اس ابتدائی علم پر مستزاد ہے، جس کے ذریعے دوسروں کی رہنمائی کی جا سکتی ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں اس بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی درجے کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے یعنی ہر ہر مکلف پر فرض ہے۔ لیکن انہی شعبوں کا اتنا علم حاصل کرنا کہ دوسروں کی رہنمائی کی جا سکے ہر ہر مکلف پر فرض نہیں ہے بلکہ پوری اجتماعیت پر بحیثیت مجموعی فرض ہے (رد المحتار علی الدر المختار) فرض عین علم سے بحث وہ حدیث مبارکہ کرتی ہے جس میں آپ ﷺ نے ہر مسلم پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا: ﴿طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ﴾ (سنن ابن ماجه) ”علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے“ جب کہ فرضِ کفایہ علم کی جانب درج ذیل آیت میں اشارہ فرمایا گیا: ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾ (التوبة: ۱۲۲) ”تو کیوں نہ ہو کہ ان (مسلمانوں) کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں تاکہ وہ بھی بچیں (نافرمانی سے)“۔

فقہاء کے مطابق اسلام کے بنیادی فرائض میں سے ہے کہ انسان اتنا علم حاصل کرے جو اس کے دین پر قائم رہنے کے لیے، اپنے عمل کے اللہ کے لیے خالص ہونے اور بندوں کے ساتھ اسلامی معاشرت کے لیے ضروری ہے، اور ہر مسلمان مرد و عورت پر لازم ہے کہ وہ وضو، غسل نماز اور روزے کے مسائل کا علم حاصل کرے، صاحب نصاب کے لیے زکاۃ اور صاحب استطاعت کے لیے حج کے مسائل سیکھنا بھی فرض ہے، تاجروں پر بیع و شراء کا علم حاصل کرنا اور ہر پیشے کے حاملین کے لیے اپنے پیشے کی بابت سیکھنا فرض ہے تاکہ تمام معاملات میں حرام اور مکروہات و شبہات سے بچ سکے، پس انسان جس کام سے بھی اشتغال رکھے اس کی بابت علم حاصل کرنا بھی اس پر فرض ہے۔ پانچ ارکان اسلام کے بارے میں علم حاصل کرنے کی فرضیت بالکل ظاہر و باہر ہے اور اسی طرح علم اخلاص (تزکیہ نفس) سیکھنا بھی لازم ہے کیونکہ اسی پر عمل کی صحت کا دارومدار ہے۔ پس حلال و حرام کے مسائل کی طرح ریا سے بچنے کا علم حاصل کرنا بھی فرض ہے کیونکہ عامل ریا کی وجہ سے اپنے اجر سے محروم رہ سکتا ہے۔ اسی طرح حسد اور عجب وغیرہ کا علم حاصل کرنا بھی فرض ہے کیونکہ یہ نیکیوں کو اس طرح کھا جاتے ہیں جیسے کہ آگ لکڑی کو، اسی طرح بیع و شراء اور نکاح و طلاق کے مسائل سیکھنا اشخاص پر فرض ہو جاتا ہے جب وہ ان میں مشغول ہونے کا ارادہ کر لیں۔

اب تک کی بحث میں ہم نے سمجھا کہ علم دین یا فقہ فی الدین کے تین شعبے ہیں یعنی علم الاعتقاد یا علم الکلام، علم الاحکام یا علم الاعمال اور علم الاخلاق یا تزکیہ نفس و احسان۔ دوسری اہم بات یہ سمجھیے کہ ان تینوں شعبوں کا اتنا علم کہ جس کی روشنی میں انسان اپنے اعتقاد، اعمال اور اخلاق کی اصلاح کر سکے ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ انہی تین شعبوں کا اتنا علم کہ جس سے دوسروں کی رہنمائی کی جا سکے تمام امت پر فرض کفایہ ہے البتہ اس فرض کفایہ کا اہتمام کرنا اولو الامر کی ذمے داری ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں پر اولو الامر کی اطاعت لازمی قرار دی ہے۔

اولو الامر کی تفسیر

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اصحاب امر کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ (النساء: 59) ”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو اور تم میں سے جو لوگ صاحب اختیار ہوں ان کی بھی“۔ اس آیت کے شان نزول میں، ابن جریر رحمہ

اللہ، ابن کثیر رحمہ اللہ اور دوسرے مفسرین نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک مہم پر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر روانہ کیا جبکہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بطور ماتحت لشکر میں شامل تھے۔ دونوں میں بعض امور پر اختلاف ہوا تو یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو اس شان نزول سے واضح ہوتا ہے کہ اولی الامر سے مراد امراہیں۔ لیکن دوسری طرف جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اسی آیت میں اولی الامر کی تفسیر میں فرمایا ﴿أُولِي الْفِقْهِ وَالْخَيْرِ﴾ "علم اور تقوی والے"۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں اس حدیث پر یہ تبصرہ کیا ہے: هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ لَهُ شَاهِدٌ، وَتَفْسِيرُ الصَّحَابِيِّ عِنْدَهُمَا مُسْنَدٌ، "یہ حدیث صحیح ہے اور اس کا ایک شاہد بھی ہے اور حضرات شیخین (بخاری و مسلم) کے نزدیک تفسیر صحابی، حدیث مرفوع کے حکم میں ہے"۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ﴿أَهْلَ الْفِقْهِ وَالدِّيْنِ، وَأَهْلِ طَاعَةِ اللهِ الَّذِينَ يُعَلِّمُونَ النَّاسَ مَعَالِيَ دِينِهِمْ وَيَأْمُرُونَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ، وَيَنْهَوْنَهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ، فَأَوْجَبَ اللهُ طَاعَتَهُمْ﴾ "علم و عمل دین اور فقہ کے حاملین اور اللہ کے اطاعت گزار بندے جو لوگوں کو دینی اقدار کی تعلیم دیتے ہیں انھیں نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں پس اللہ نے عوام پر ان کی اطاعت لازم قرار دی ہے"۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان دونوں تفسیروں کو جمع کرتے ہوئے لکھا ہے: وَالظَّاهِرُ -وَاللهُ أَعْلَمُ- أَنَّ الْآيَةَ فِي جَمِيعِ أُولِي الْأَمْرِ مِنَ الْأُمَرَاءِ وَالْعُلَمَاءِ "ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت تمام اولی الامر کو شامل ہے یعنی امرا کو بھی اور علماء کو بھی"۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اولو الامر میں علمائے کرام کے ساتھ ساتھ اجتماعی نظم کو چلانے والے امرا بھی شامل ہیں۔ پس جہاں علماء کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی فقہ فی الدین کا اہتمام کریں وہیں حکمرانوں کو بھی چاہیے کہ وہ علماء اور طلبہ کی ضروریات و سہولیات کا اہتمام کریں تاکہ معاشرے میں فقہ و تفقہ کا دور دورہ ہو سکے۔

قیادت و حکومت کے لیے علم و فقہ کی ضرورت

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان معاشروں میں قیادت و سیادت کے اہل بھی وہی لوگ ہیں جو تفقہ فی الدین کے حامل ہوں۔ منافقین کا یہ طرز عمل تھا کہ بغیر تحقیق کے خبریں اور افواہیں پھیلایا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی

تادیب کرتے ہوئے فرمایا:﴿وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾ (النسا: 83) ”اور اگر یہ اس (خبر) کو رسول کے پاس یا اصحاب اختیار کے پاس لے جاتے تو ان میں سے جو لوگ اس کی کھوج نکالنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے“۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور اصحاب امر، دونوں کا وظیفہ استنباط بتایا ہے اس سے ضمنی طور پر یہ رہنمائی ملتی ہے کہ حکمرانوں میں استنباط کی اہلیت ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قول بہت چشم کشا ہے فرماتے ہیں:﴿مَنْ سَوَّدَهُ قَوْمُهُ عَلَى الْفِقْهِ كَانَ حَيَاةً لَهُ وَلَهُمْ، وَمَنْ سَوَّدَهُ قَوْمُهُ عَلَى غَيْرِ فِقْهٍ كَانَ هَلَاكًا لَهُ وَلَهُمْ﴾(سنن الدارمي) ”جسے اس کی قوم نے اپنا سردار بنا لیا اس کے دینی علم اور فقاہت کی بنا پر تو یہ سردار بننا اس کے لیے بھی زندگی ہے اور پوری قوم کے لیے بھی زندگی ہے، اور جسے اس کی قوم نے سردار بنا دیا اس کی فقاہت کے بغیر تو اس کی بھی ہلاکت ہے اور پوری قوم کی بھی ہلاکت ہے“۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اسی قسم کا ایک فرمان امام بخاری رحمہ اللہ نے نقل کیا:﴿تفقّهوا قَبْلَ أَنْ تُسَوَّدُوا﴾ ”سردار بننے سے پہلے فقاہت حاصل کرو“۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اپنی طرف سے خاص بات لکھی ہے: (وَبَعْدَ أَنْ تُسَوَّدُوا) ” ”اور سردار بننے کے بعد بھی علم حاصل کیا کرو“ ”تُسَوَّدُوا“ سے بعض اہل علم نے سردار بننا مراد لیا ہے جسے ہم نے اختیار کیا ہے جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے مراد، عمر میں بڑا ہونا مراد لیا ہے اسی لیے وہ آگے چل کر لکھتے ہیں :وَقَدْ تَعَلَّمَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ ﷺ فِي كِبَرِ سِنِّهِمْ (صحيح بخاری، كتاب العلم) ”یقینی طور پر (اکثر) صحابہ نے علم بڑی عمر میں ہی سیکھا ہے“۔

حکمرانوں کی علمی سرپرستی اور صدر اول

دین کے علم اور فقاہت کی اتنی اہمیت تھی کہ نبی کریم ﷺ جب امرا کو مختلف بلاد و امصار میں حاکم بناتے تھے تو انھیں عدل و انصاف کے ساتھ ساتھ تعلیم دین کی تاکید بھی فرماتے تھے۔ جب آپ ﷺ نے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو تسمیہ کے بعد تحریر فرمایا: ”یہ وثیقہ ہے اللہ اور رسول کی طرف سے اے اہل ایمان اپنے

وعدوں کو پورا کرو یہ عہد ہے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے عمرو بن حزم کے لیے جبکہ وہ اسے یمن کی طرف روانہ فرمارہے ہیں اور انھیں حکم دیتے ہیں اپنے فیصلوں میں تقوی اختیار کرنے کا، پس بے شک اللہ ان کے ساتھ ہے جنھوں نے تقوی اختیار کیا اور جو نیکوکار ہوئے، اور انھیں مکرر حکم دیتے ہیں حق کو اختیار کیے رکھنے کا، اور اس کا حکم دیتے ہیں کہ لوگوں کو اچھے انجام کی بشارت دے اور نیکی کا حکم دے اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے اور اور قرآن میں فقاہت پیدا کرنا سکھائے اور لوگوں کو برائی سے روکتا رہے"۔

اسی طرح جب فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ حنین کے لیے روانہ ہوئے تو مکہ پر سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اہل مکہ پر عامل مقرر کیا اور انھیں حکم دیا:﴿أَنْ يُعَلِّمَ النَّاسَ الْقُرْآنَ وَيُفَقِّهَهُمْ فِي الدِّينِ﴾ کہ وہ انھیں قرآن پڑھائیں اور تفقہ فی الدین کی تعلیم دیں"۔(دلائل النبوة للبيهقي) نبی اکرم ﷺ نے ایک بار سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف عامل بنا کر بھیجا تو انھیں حکم دیا:﴿يُعَلِّمُ النّاسَ الْقُرآنَ وشَرائِعَ الإسْلامِ ويَقْضِي بَيْنَهُم﴾ "وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور اسلام کے احکام شریعت بھی سکھائیں اور ان کے مطابق لوگوں میں فیصلے بھی فرمائیں"۔(إمتاع الأسماع للمقريزي) حضرت عمر رضی اللہ عنہ، امرا کی ذمے داریوں میں یہ بھی بتاتے کہ وہ لوگوں کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کریں اپنے ایک خطبے میں آپ فرماتے ہیں:﴿أَلاَ إِنِّي وَاللهِ مَا أَبْعَثُ إِلَيْكُمْ عُمَّالاً لِيَضْرِبُوا أَبْشَارَكُمْ ، وَلاَ لِيَأْخُذُوا أَمْوَالَكُمْ ۚ وَلَكِنْ أَبْعَثُهُمْ إِلَيْكُمْ لِيُعَلِّمُوكُمْ دِينكُمْ وَسُنَّتَكُمْ فَمَنْ فُعِلَ بِهِ سِوَى ذَلِكَ فَلْيَرْفَعْهُ إِلَيَّ﴾(مصنف ابن أبي شيبه) "آگاہ رہو، خدا کی قسم میں نے تم پر عمّال اس لیے نہیں مقرر کیے کہ وہ تمھاری کھال ادھیڑ دیں اور نہ ہی اس لیے کہ تمھارے مال ضبط کرتے رہیں بلکہ میں تو انھیں تمھاری طرف اس لیے بھیجتا ہوں کہ تاکہ وہ تمھارا دین اور سنت تمھیں سکھائیں، پس جو کوئی اس کے علاوہ کوئی حرکتیں کرے تو اس کی اطلاع مجھ تک پہنچایا کرو"۔

اب حدیث کے اگلے الفاظ کی طرف آتے ہیں:

﴿وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللهِ يُعْطِي﴾ "میں تو بانٹنے والا ہوں اور دینے والی ذات تو اللہ ہی کی ہے"۔ نبی اکرم ﷺ

نے اپنے لیے تقسیم کنندہ کا لفظ استعمال فرمایا۔اس ایک لفظ میں گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔تقسیم کرنے میں ”دینے“ سے زیادہ اہتمام شامل ہوتا ہے اور تقسیم کرنے میں بسا اوقات تقسیم کرنے والا، وصول کنندہ کو براہ راست کچھ نہیں دیتا بلکہ اُس کی طرف سے اس کے نمائندے لوگوں تک چیز پہنچادیتے ہیں۔تو لفظ قاسم میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ علم کے تقسیم کرنے والے ہیں تو بالاہتمام آپ ﷺ سے یہ علم حاصل کیا جائے۔اسی اہتمام کا نام تعلم یعنی شاگردی اختیار کرنا ہے اور یہ مفہوم بھی اس لفظ میں پایا جاتا ہے کہ کبھی تو علم آپ ﷺ سے براہ راست حاصل کیا جاسکے گا جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حاصل کیا اور کبھی ایسا ممکن نہ رہے گا تو آپ ﷺ کے وارثان یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے قائم کردہ سلسلہ علمی سے رجوع کرنا پڑے گا۔اس معنی کی طرف اشارہ ہمیں امام ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے ہاں ملتا ہے وہ فرماتے ہیں:وَالْمَعْنَى لَيْسَ الْعِلْمُ الْمُعْتَبَرُ إِلَّا الْمَأْخُوذَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَوَرَثَتِهِمْ عَلَى سَبِيلِ التَّعَلُّمِ(فتح الباري)” اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم معتبر وہی ہے جو انبیاے کرام یا ان کے وارثان یعنی علماء سے بر سبیل تعلم ماخوذ ہو“۔

شاگردی کی ضرورت

احادیث مبارکہ میں تعلم کی بہت تاکید آئی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے سیکھنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ﴾(صحيح الترغيب و الترهيب)”اے لوگو علم تو سیکھنے ہی سے آتا ہے“۔ایک حدیث میں آتا ہے:﴿تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوهُ النَّاسَ، تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوهَا النَّاسَ تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ وَعَلِّمُوهُ النَّاسَ، فَإِنِّي امْرُؤٌ مَقْبُوضٌ، وَالْعِلْمُ سَيُقْبَضُ، وَتَظْهَرُ الْفِتَنُ حَتَّى يَخْتَلِفَ اثْنَانِ فِي فَرِيضَةٍ لَا يَجِدَانِ أَحَدًا يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا﴾(سنن الدارمي، دارقطني) ” علم حاصل کرو اور دوسروں کی بھی تعلیم کا اہتمام کرو، فرائض (یعنی علم وراثت) کا علم حاصل کرو اور دوسروں کو اس کی تعلیم دو قرآن کا علم حاصل کرو اور دوسروں کو اس کی تعلیم دو پس میں ایک بندہ ہوں جو اٹھالیا جاؤں گا اور عنقریب علم بھی اٹھالیا جائے گا اور فتنے پھیل جائیں گے یہاں تک کہ کسی فریضے میں دو بندے بھی ایسے نہ ملیں گے جو فیصلہ کرسکیں“۔

اس حدیث میں علم قرآن کے ساتھ دوسرے علوم کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور ان سب کے لیے پہلے تعلم یعنی سیکھنے کا ذکر ہے اور اس کے بعد تعلیم یعنی دوسروں کو سکھلانے کا ذکر ہے، یہ ایک فطری ترتیب ہے۔ کہ پہلے اچھی طرح سیکھا جائے اور پھر اس کے بعد آگے سکھایا جائے۔

بعض دفعہ دعوت و تبلیغ کے شوق میں اور امت کے وسیع تر یا فوری مفاد کی خاطر انسان باضابطہ علم حاصل کیے بغیر، استاد بن بیٹھتا ہے۔ یہ ایک خطرناک امر اور بہت ساری غلطیوں کا موجب ہے۔ جبکہ اصل یہ ہے کہ انسان شاگردی اختیار کرے اور پھر علم کی خدمت کی نیت سے میدان میں آئے۔ پھر اگر اللہ نے چاہا تو وہ استاذ کے منصب پر بھی فائز ہو جائے گا۔ صحیح معنوں میں استاد کے منصب کے اہل وہی ہے جو شاگردی اختیار کر چکا ہو۔ سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: ﴿لاَ تَكُونُ عَالِمـًا حَتَّى تَكُونَ مُتَعَلِّمـًا﴾ (سنن الدارمي) "تم عالم نہیں بن سکتے جب تک کہ طالب علم نہ بنو"۔

طُرُقِ تعلم

امام شاطبی رحمہ اللہ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "الموافقات" کا بارہواں مقدمہ حصول علم کے طریقوں کے بیان پر قائم کیا ہے۔ ہم ان کی بحث کا ایک خلاصہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ پہلے آپ نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا استاد کے بغیر علم کا حصول ممکن ہے یا نہیں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ اس کا امکان تو موجود ہے لیکن انسانوں میں عادت یہی جاری ہے کہ استاد ہی سے علم حاصل کیا جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر ممکن کا حصول، ہر ایک کے لیے اور تمام اوقات میں ممکن نہیں ہوتا یعنی نظری طور پر جس چیز کا امکان پایا جاتا ہو یہ ضروری نہیں کہ فی الواقع اسے پا بھی لیا جائے اور اگر بعض لوگ اسے پا بھی لیں تو یہ نادر ہوتا ہے جو معدوم ہی کے درجے میں ہوتا ہے، اس لیے کہ ہر ایک کے لیے اس کا حصول مشکل ہوتا ہے۔ ہر ایک کے لیے ممکن الحصول اور سہل الوصول وہ امر ہوتا ہے جو اتنی کثرت سے واقع ہوتا ہو کہ وہ عادت بن چکا ہو۔ چونکہ استاد کے ذریعے علم حاصل کرنا امر عادی بن چکا ہے تو اسی طریقے کو اصل طریقہ کہنا چاہیے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ نے علماء کا یہ قول نقل کیا ہے: إِنَّ الْعِلْمَ كَانَ فِي صُدُورِ الرِّجَالِ، ثُمَّ انْتَقَلَ إِلَى الْكُتُبِ، وَصَارَتْ مَفَاتِحُهُ بِأَيْدِي الرِّجَالِ "بے شک علم صدورِ رجال میں تھا پھر یہ کتابوں میں منتقل ہوا، اور اس کی چابیاں پھر بھی رجال کے ہاتھ ہی میں ہیں"۔ اسی کی جانب قرآن پاک کی اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے: ﴿بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ﴾ (العنکبوت : 49) "بلکہ وہ واضح آیات ہیں، ان لوگوں کے سینوں میں جنھیں علم دیا گیا ہے"۔

امام شاطبی رحمہ اللہ علماء کا مندرجہ بالا قول لکھنے کے بعد تحریر کرتے ہیں: وَهَذَا الْكَلَامُ يَقْضِي بِأَنْ لَا بُدَّ فِي تَحْصِيلِهِ مِنَ الرِّجَالِ "یہ قول تقاضا کرتا ہے کہ علم کو صاحبان علم ہی سے حاصل کرنا چاہیے"۔ امام لکھتے ہیں اس اصول کی دلیل نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ اللهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ النَّاسِ، وَلَكِنْ يَقْبِضُهُ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ﴾ "بے شک اللہ تعالیٰ علم کو ایسے قبض نہیں کرے گا کہ اسے لوگوں کے درمیان سے کھینچ لے بلکہ وہ علماء کو اٹھا کر علم کو اٹھائے گا"۔ امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: لَيْسَ هُوَ مَحْوُهُ مِنْ صُدُورِ حُفَّاظِهِ وَلَكِنْ مَعْنَاهُ أَنَّهُ يَمُوتُ حَمَلَتُهُ "علم کے اٹھانے کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ حفاظ کے سینوں سے اسے محو کر دے بلکہ معنی یہ ہے کہ اللہ علم والوں کو موت دے دے گا"۔ تو رسول اللہ ﷺ نے یہاں رفع علم کو صاحبان علم کے ساتھ جوڑا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ علم کا انحصار اصل میں میں عالِم و معلم پر ہے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ مندرجہ بالا حدیث بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: فَإِذَا كَانَ كَذَلِكَ، فَالرِّجَالُ هُمْ مَفَاتِحُهُ بِلَا شَكٍّ فَإِذَا تَقَرَّرَ هَذَا؛ فَلَا يُؤْخَذُ إِلَّا مِمَّنْ تَحَقَّقَ بِهِ "پس جب معاملہ ایسا ہے تو لاریب اشخاص ہی علم کے مفاتیح و کنجیاں ہیں اور جب یہ طے ہو گیا تو اگلی بات یہ ہے کہ علم اسی عالم سے حاصل کیا جائے جو علم میں پختہ ہو چکا ہو"۔ اسی انداز کا ایک قول عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے فرماتے ہیں: ﴿لَا يَزَالُ النَّاسُ صَالِحِينَ مُتَمَاسِكِينَ مَا أَتَاهُمُ الْعِلْمُ مِنْ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ ﷺ وَمِنْ أَكَابِرِهِمْ، فَإِذَا أَتَاهُمْ مِنْ

أَصَاغِرِهِمْ هَلَكُوا﴾ (رواه الطبراني في الكبير والأوسط، ورجاله موثقون)" لوگ نیکی پر قائم اور، راسخ رہیں گے جب تک ان کے پاس علم اصحاب محمد ﷺ اور ان کے دوسرے اکابر سے آتا رہے گا اور جب ان کے پاس علم اصاغر سے آنے لگے تو وہ ہلاک ہو جائیں گے"۔

اس کے بعد امام صاحب عالم متحقق کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: عالم متحقق کی نشانی ایک تو یہ ہے کہ وہ عالم باعمل ہو اور اس کا عمل اس کے قول کے مطابق ہو دوسری شرط یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جنھوں نے شیوخ کے ہاتھ پر تربیت پائی ہو ان سے علم حاصل کیا ہو اور ان کی صحبت و ملازمت اٹھائی ہو، سلف صالحین کی شان یہی تھی اور اس میں سب سے پہلے صحابہ کرام ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت و ملازمت سے نفع اٹھایا تھا اور اس کے بعد تابعین آئے جنھوں نے صحابہ کرام کی صحبت و ملازمت اختیار کی اور فقاہت اور علوم شرعیہ میں مہارت حاصل کی۔ یہ اتنا پختہ قاعدہ ہے کہ تم ہر مشہور عالم کو دیکھو گے کہ وہ اپنے شیخ کے ساتھ مدتوں لگا رہا ہو گا اور تم گمراہ فرقوں اور مخالف سنت گروہوں کو دیکھو گے کہ وہ شیوخ کی ملازمت سے بے بہرہ ہوں گے۔ تیسری شرط یہ کہ وہ عالم اپنے شیوخ اور ان کے آداب کا اتباع کرنے والا ہو جیسا کہ تم صحابہ کو پاتے ہو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرتے تھے اور تابعین کو دیکھتے ہو کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتباع کرتے تھے اور اسی طرح ہر زمانے کے لوگ اپنے اساتذہ کا اتباع کرتے چلے آئے ہیں۔

حصول علم کے دو طریقے

امام شاطبی رحمہ اللہ نے حصول علم کے دو طریقے بتائے ہیں:

پہلا طریقہ تو بالمشافہہ ہے یعنی براہ راست استاد کی صحبت میں رہ کر علم حاصل کرنا، یہ زیادہ نفع مند اور محفوظ طریقہ ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں: اللہ تعالیٰ نے معلم و متعلم کے رابطے میں ایک خاصیت اور تاثیر رکھی ہے، علم اور علماء سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اس پر گواہ ہے۔ کتنی ہی بار ایک شاگرد کسی کتاب میں علم کی کوئی بات پڑھتا ہے اسے دہرا کر یاد کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس بات کو سمجھ نہیں سکتا، جوں ہی وہ یہ بات اپنے معلم کے سامنے پیش کرتا ہے تو اچانک اس کی سمجھ میں آنا شروع ہو جاتا ہے، یہ فہم کبھی تو کسی عادی قرینے سے حاصل ہوتا ہے اور کبھی یہ فہم کسی قرینے کے بغیر حاصل ہوتا ہے، لیکن یہ فہم اللہ کی خصوصی توفیق ہوتی ہے جو اسے معلم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ

کرنے پر عطا کی جاتی ہے۔ اس تاثیر کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ وفات و تدفین رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے دلوں کی حالت کو بدلا ہوا پایا اور سیدنا حنظلہ رضی اللہ عنہ کے واقعے میں بھی ادھر اشارہ پایا جاتا ہے جب انھوں بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آپ کی محفل میں ہم حالت رضا میں ہوتے ہیں اور جب جدا ہوتے ہیں تو حالت بدل جاتی ہے۔ پس جب شاگرد اپنے استاد کے سامنے ہوتا ہے تو اس پر علم کے وہ دروازے کھلتے ہیں جو استاد کے بغیر نہیں کھلتے اور جب وہ اپنے استاد کے ادب و آداب کی پیروی کرتے ہیں تو انھیں ایک نور عطا کیا جاتا ہے''۔

اس کے بعد حضرت امام شاطبی رحمہ اللہ نے علم کا دوسرا ذریعہ کتب کا مطالعہ بتایا ہے۔ اس ضمن میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ تحقیق و تنقید کے تو خیر الگ اصول بھی ہیں اور اس کے رجال بھی الگ ہی ہوتے ہیں لیکن جہاں تک عام لوگوں کے استفادے کی بات ہے تو اوپر علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے جس قسم کے علماء سے علم سیکھنے کی تاکید کی ہے تو اسی قسم کے مصنفین کی کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ بہر حال امام شاطبی رحمہ اللہ نے کتابوں سے علم حاصل کرنے کے طریقے کے نفع مند ہونے کی دو شرائط بیان کی ہیں۔ پہلی شرط یہ کہ قاری کو اپنے مطلوب علم کے بنیادی اصول و مقاصد اور اس کی متعلقہ اصطلاحات کی واقفیت حاصل ہو تاکہ وہ کتابوں سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے۔

اب سوال یہ ہے کہ اصطلاحات علمی یا اصول کہاں سے لیے جائیں... کیا کسی کتاب سے دیکھ لیے جائیں؟ امام شاطبی رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیتے ہوئے دو چیزیں بتائی ہیں: وذلك يحصل بالطريق الأول، ومن مُشَافَهَةِ الْعُلَمَاءِ، أَوْ مِمَّا هُوَ رَاجِعٌ إِلَيْهِ ''یہ واقفیت پہلے طریقے یعنی علماء سے بالمشافہ حاصل کی جائے گی یا پھر کسی طریقے سے جو اسی پہلے طریقے کی طرف راجع ہو''۔ علامہ کے نزدیک مطالعے کا بہترین فائدہ اسے ہی ہو سکتا ہے جو پہلے علماء کے علمی سلسلے سے منسلک ہو کر ابتدائی علم اور اس کے اصول و اصطلاحات سیکھ چکا ہو اور بعد میں مزید اضافے یا تفہیم کی غرض سے مطالعہ کر رہا ہو۔ أَوْ مِمَّا هُوَ رَاجِعٌ إِلَيْهِ، ''یا پھر کسی طریقے سے جو اسی پہلے طریقے کی طرف راجع ہو''۔ اس دوسرے طریقے کو عرض کہا جا سکتا ہے یعنی جس نے پہلے علماء سے بالمشافہ اتنا علم حاصل نہیں کیا کہ وہ اصطلاحات علمی اور بنیادی اصولوں سے واقف ہو سکے تو اسے چاہیے کہ گاہے گاہے علماء کی خدمت میں حاضر ہو کر ان

اصطلاحات کا مطلب اور اپنے حاصل مطالعہ کی صحت معلوم کرتا رہے۔ یہ عرض والا طریقہ بیان کرنے کے بعد امام لکھتے ہیں: وَهُوَ مَعْنَى قَوْلِ مَنْ قَالَ: كَانَ الْعِلْمُ فِي صُدُورِ الرِّجَالِ، ثُمَّ انْتَقَلَ إِلَى الْكُتُبِ، وَمَفَاتِحُهُ بِأَيْدِي الرِّجَالِ "اور یہی مراد ہے اس فرمان سلف کی: "علم صدورِ رجال میں تھا پھر کتابوں کی طرف منتقل ہوا لیکن ان کی کنجیاں، رجال علم ہی کے ہاتھوں میں ہیں"۔

اسلاف کے اس قول کی یہ بہت عمدہ توجیہ ہے کہ علم رجال کے سینوں سے کتابوں میں منتقل ہوا لیکن اس کے بعد بھی استاد سے مستغنی نہیں ہوا جا سکتا بلکہ عرض و رجوع کے ذریعے جب علماء کی احتیاج کو قائم رکھا گیا تو علم کی کنجیاں واقعی رجال علم ہی کے ہاتھ میں رہیں۔

اب رہا وہ شخص جو بغیر کسی استاد کی رہنمائی کے کتابوں سے علم حاصل کر رہا ہے تو اس کے بارے میں امام لکھتے ہیں: " اکیلی کتاب طالب علم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی جب تک علماء سے رہنمائی نہ لی جائے اور یہ عام مشاہدے کی چیز ہے"۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: كَانَ هَذَا الْعِلْمُ كَرِيمًا يَتَلَقَّاهُ الرِّجَالُ بَيْنَهُمْ، فَلَمَّا دَخَلَ فِي الْكُتُبِ دَخَلَ فِيهِ غَيْرُ أَهْلِهِ (المدخل إلى السنن الكبرى) "یہ علم بہت عزت والا تھا، اشخاص ایک دوسرے سے اسے حاصل کیا کرتے تھے، پھر یہ کتابوں میں داخل ہوا تو غیر اہل لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا"۔

مطالعے میں انسان، اپنا معلم خود ہوتا ہے اس لیے کہ وہ بعض اوقات متن کے ایسے معنی لے لیتا ہے جو لینا درست نہیں ہوتا اور اپنی سمجھ پر انحصار کر کے وہ کسی ایک معنی کو حتمی سمجھ لیتا ہے۔ کتاب قاری کو غلط معنی لینے سے روک نہیں پاتی نہ ہی وہ اس کی اصلاح کر سکتی ہے۔ اس لیے استاد کا ہونا لازمی اور صرف کتاب پر انحصار کرنا خطرناک ہے۔

اپنی علمی ضروریات کو، استاد سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے صرف کتاب سے پورا کرنے کی تغلیط و تنقید میں امام شاطبی رحمہ اللہ اور امام اوزاعی رحمہ اللہ اکیلے نہیں ہیں بلکہ اسلاف میں اس مضمون کے متعدّد اقوال تذکرة السامع والمتكلم في أدب العالم والمتعلم میں منقول ہیں، یہ قول دیکھیے: من كان الشيخ كتابه كان خطؤه أكثر من صوابه "جس کا شیخ اس کی کتاب ہو گی اس کی خطائیں اس کی درستیوں سے زیادہ ہوں گی"۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا

قول ہے:من تفقه من بطون الكتب ضيع الأحكام'' جو کتابوں سے فقیہ بننا چاہتا ہے وہ اکثر احکام ضائع کردیتا ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں:من أعظم البلية مشيخة الصحيفة '' ایک بڑی مصیبت کتاب کو استاد بنالینا ہے''۔

کتابوں سے استفادے کے فائدہ مند ہونے کی دوسری شرط امام نے یہ بیان کی ہے کہ اپنے مطلوبہ علم میں متقدمین کی کتابوں کا شوق رکھے اس لیے کہ ان میں علمی پختگی متاخرین کی نسبت زیادہ پائی جاتی ہے۔

اب ہم حدیث مبارکہ کے آخری حصے کی طرف آتے ہیں:

﴿وَلَنْ تَزَالَ هَذِهِ الأُمَّةُ قَائِمَةً عَلَى أَمْرِ اللهِ لاَ يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللهِ﴾ ''یہ امت اللہ کے امر پر قائم رہے گی، اس کی مخالفت کرنے والا بھی انھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے''۔پچھلی بحث میں ہم نے امام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے ایک قول کا ذکر کیا تھا جس میں انھوں نے علمِ معتبر کی تعریف میں کہا تھا:الْمَأْخُوذُ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَوَرَثَتِهِمْ عَلَى سَبِيلِ التَّعَلُّمِ '' جو انبیاے کرام یا ان کے وارثان یعنی علماء سے بر سبیل تعلم ماخوذ ہو'' ۔وارثان نبوت سے مراد علمائے کرام اور ان کا سلسلۂ علمی ہے۔علامہ شاطبی رحمہ اللہ کے حوالے سے جو کلام کیا گیا وہ اصلاً تعلم کے آداب کے بارے میں تھا لیکن اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حصول علم کا اصل طریقہ صاحبان علم سے علم حاصل کرنا ہے۔ابن حجر رحمہ اللہ نے انھیں وارثانِ انبیا کا نام دیا تھا۔جو اصل میں ایک حدیث مبارکہ سے ماخوذ ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:﴿إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا وَإِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ﴾(سنن أبي داود، سنن ترمذي)'' بے شک علماء انبیا کے وارث ہیں اور انبیا درہم و دینار نہیں چھوڑ جاتے بلکہ وہ علم چھوڑ کر جاتے ہیں پس جس نے علم حاصل کیا اس نے نبیوں کے ترکے سے بڑا حصہ پالیا''۔

علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے عالم متحقق کی جو علامتیں بیان کی ہیں اور علم کے حصول کے جو طریقے بیان کیے ہیں، تو ہم عرض کرتے ہیں کہ ان صفات کا مظہر، اہل سنت کا وہ علمی سلسلہ ہے جو تربیت و تزکیہ اور فقہ و تفقہ میں اتصالِ سند کا حامل ہے۔اور اسی کی طرف اشارہ اس فرمان میں ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:﴿يَرِثُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ

عُدُولُهُ يَنْفُونَ عَنْهُ تَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَحْرِيفَ الْغَالِينَ﴾(السنن الكبری للبيهقي) ”پچھلی نسلوں کے عادل لوگ، اس علم کی وراثت، (اپنے ہی جیسے سلف سے) پائیں گے، اور وہ عادل لوگ، اس علم میں سے، جاہل لوگوں کی تاویلات، جھوٹوں کی غلط دعوے داریوں اور غالیوں کی تحریفات کی نفی کریں گے۔

حدیث زیر مطالعہ کے آخری الفاظ اسی جانب رہنمائی کر رہے ہیں:

﴿وَلَنْ تَزَالَ هَذِهِ الأُمَّةُ قَائِمَةً عَلَى أَمْرِ اللهِ لاَ يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللهِ﴾ ”یہ امت اللہ کے امر یعنی دین پر قائم رہے گی ان کی مخالفت کرنے والا انھیں ضرر نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آجائے“۔اس حدیث میں پوری امت کے حق پر قائم رہنے کا ذکر ہے لیکن در حقیقت یہاں امت سے وہ حامل الفقہ گروہ مراد ہے جس کی طرف اشارہ حدیث زیر مطالعہ کے ابتدائی الفاظ﴿مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ﴾ سے نکلتا ہے۔اس حدیث کے دوسرے طرق کے الفاظ کا تتبع بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔مسند احمد کی ایک روایت میں فقہ کے ساتھ ایک گروہ مخصوص کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:﴿مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ، وَلَنْ تَزَالَ هَذِهِ الْأُمَّةُ أُمَّةً قَائِمَةً عَلَى أَمْرِ اللهِ﴾ ”جس کے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں فقاہت دیتا ہے اور اس امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے دین پر قائم رہے گا“۔صحیح بخاری، کتاب الاعتصام میں امام بخاری رحمہ اللہ، اس سے ملتی جلتی روایت لائے ہیں:﴿لاَ يَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللهِ﴾ میری امت میں سے ایک جماعت اللہ کے امر پر قائم رہے گی“ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس گروہ کی تعیین ان الفاظ میں کی ہے:(وَهُمْ أَهْلُ الْعِلْمِ) ” اور یہ گروہ اہل علم کا ہے“۔امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں: (وَفِيهِ دَلِيلُ لِكَوْنِ الْإِجْمَاعِ حُجَّةً) ”اس حدیث میں اجماع کے حجت ہونے کی دلیل ہے“ اور اجماع کے واقفان جانتے ہیں اجماع اہل علم وفقہا کا معتبر ہوتا ہے نہ کہ عوام کا تو گویا امام نووی کے نزدیک بھی جس امت کے قائم علی الحق ہونے کا ذکر ہے اس سے مراد اہل علم کا گروہ ہے۔

اب ہماری بحث یہاں مکمل ہوتی ہے کہ دین میں تفقہ کے حصول کے لیے باضابطہ تحصیل علم ضروری ہے اور اس تحصیل کے لیے اہل سنت کے علمی سلسلے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔چونکہ اہل سنت کے علماء کا اجماع حجت ہے لہذا تعلیم و تعلم اور تمام دوسرے معاملات میں اجماع اہل علم کی پیروی کرنی چاہیے اور اس کے خلاف نہیں جانا چاہیے۔

اختلاف فقہاء کی حقیقت

حافظ معاذ بن تجمل

(مستفاد من فتاوی ابن تیمیہ)

نبی کریم ﷺ کی رفیقِ اعلی کی طرف مراجعت کے ساتھ ہی وحی آسمانی کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا۔ وحی متلو اور وحی غیر متلو کا ایک ذخیرہ آپ ﷺ چھوڑ گئے۔ اس وحی کو تاقیام قیامت انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ قرار دیا ہے اسی لیے یہ امانت ان تک لفظاومعنا منتقل کرنے کی ضرورت تھی۔﴿بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللهِ﴾ کے فحوی کے مطابق علماء کو اس ذمے داری پر فائز کیا گیا۔ یہ ذمے داری اس حدیث سے بھی واضح ہوتی ہے کہ جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ﴾ "بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں" اور آپ ﷺ سے یہ بھی ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿وَدِدْت أَنِّي قَدْ رَأَيْت خُلَفَائِي﴾ "میری خواہش ہے کہ میں اپنے خلفا کو دیکھوں" ۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: "اے اللہ کے نبی آپ کن خلفا کو دیکھنا چاہتے ہیں"؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ﴿الَّذِينَ يُحْيُونَ سُنَّتِي يُعَلِّمُونَهَا النَّاسَ﴾ "جو میری سنتوں کو زندہ کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے"۔

توصحابہ کے دور سے علمائے کرام نے قرآن و سنت کو سینہ بہ سینہ آگے منتقل کر کے اپنی حفاظت دین کی ذمے داری کو ادا کیا۔ نصوص شرعی کو آگے منتقل کرنا کافی نہ تھا بلکہ اس سے اہم تر کام یہ تھا کہ گنتی کے اعتبار سے محدود اور پس منظر کے اعتبار سے مخصوص، نصوص کو پیش آیندہ احوال پر منطبق کرتے ہوئے لوگوں کو حکم شرعی بتایا جائے۔ یہی وہ اجتہاد ہے جس کا نہ صرف دروازہ نبی کریم ﷺ نے کھولا تھا بلکہ ایک خاص انداز میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گویا اس کی تربیت بھی دی تھی جب ریاست اسلامی میں وسعت پیدا ہونے کی وجہ سے اجتہاد کی ضرورت میں اضافہ ہوا تو تابعین و تبع تابعین میں سے کئی ایک مجتہدین نے اس میدان میں عمریں صرف کیں، جنھیں امت نے ائمہ کرام کا لقب

دیا۔ ائمہ کرام نے جب اجتہاد کیا تو بعض فروعی مسائل میں ان کے ہاں اختلاف بھی ہوا۔ یہی وہ اختلاف ہے جسے بعض روایات میں امت کے لیے باعث رحمت قرار دیا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے لیے مختلف حالات میں عمل کرنے کے لیے آسانی ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرام کے دور میں اس کی کئی ایک مثالیں ملتی ہیں، مثلاً: بنو قریظہ کا مشہور واقعہ جب صحابہ کرام کو حضور ﷺ نے وہاں پہنچ کر نمازِ عصر کی ادائیگی کا کہا تھا، راستہ میں جب نماز قضا ہونے کا خدشہ ہوا تو بعض نے اصل علت کو سامنے رکھ کر راستے ہی نماز پڑھ لی اور بعض نے ظاہری الفاظ کو دیکھتے ہوئے نماز قضا ہوجانے دی اور وہاں پہنچ کر ہی نماز ادا کی۔ بعد میں جب حضور ﷺ سے پوچھا گیا تو دونوں کی تصویب فرمائی۔ اس طرح کے واقعات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ علماء کی آرا کے اختلاف کو نزاع کا باعث بنانا درست نہیں، بلکہ اس اختلاف میں بھی امت کے لیے سہولت کے دروازے کھلتے ہیں۔

اس کی مثال یہ بھی ہے کہ بنو نضیر کے محاصرے کے وقت صحابہ میں کھجوروں کے درخت کاٹنے پر اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ یہ مسلمانوں کے لیے مال غنیمت ثابت ہوں گی اس لیے ان کا کاٹنا درست نہ ہوگا جب کہ بعض نے جنگی حکمت عملی کے طور پر ان درختوں کا کاٹنا زیادہ اہم سمجھا۔ پھر جب قرآن کریم کی اس بابت آیات نازل ہوئیں تو دونوں طریقوں کو درست قرار دیا: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَى أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللهِ﴾ (الحشر:۵) ''جو تم نے کھجور کا تنا کاٹا اور جسے تم نے اس کی جڑوں پہ رہنے دیا تو یہ اللہ کے اذن ہی سے تھا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد کے نتیجے میں اختلاف کا ہوجانا فطری امر ہے۔ البتہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اُصولی اَحکام کے مسائل جن کا تعلق عقائد سے ہے یا اسی طرح وہ مسائل جن میں اہلِ سنت والجماعت کا اجماع ہو، ان میں اختلاف کرنا گم راہی ہے اور ذکر کردہ ''رحمت'' کے تحت شامل نہیں ہے۔

یہ تو خیر عملی مسائل پر اختلاف تھا لیکن بعض مرتبہ علمی اعتقادی مسئلہ پر بھی اختلاف ہوجاتا ہے۔ خیر القرون میں اس کی مثالیں موجود ہیں جیسے یہ بحث کہ مردے اپنے زندہ لوگوں کی آواز سنتے ہیں کہ نہیں یا یہ بات کہ میت پر اس کے ورثا کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے کہ نہیں یا یہ امر کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا یا نہیں۔ ان مسائل میں دونوں جانب بڑے بڑے لوگوں کی آرا موجود ہیں۔

اہل سنت کے ان اختلافات کی بہترین مثال انبیاے کرام کی شریعتوں کا اختلاف ہے۔ یہ معلوم ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری رسول حضرت محمد ﷺ تک سب انبیا کا اصول دین ایک ہی تھا اور وہ اللہ کی عبادت تھا:﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ﴾(الشوریٰ:۱۳)"اس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ طے کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا، اور جو (اے پیغمبر) ہم نے تمھارے پاس وحی کے ذریعے بھیجا ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ تم دین کو قائم کرو، اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین مشترک رہا اور دین کے مشترک ہونے سے مراد یہ ہے کہ اصول دین مشترک رہا ہے اور وہ اصول دین اللہ کی توحید، اس کی عبادت اور شرک سے اجتناب ہے:﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾(النحل:۳۶)"اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر اس ہدایت کے ساتھ بھیجا ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اور طاغوت سے اجتناب کرو"۔ دین اور اصولِ دین کے بعد عبادت کے طریقے یعنی شریعت میں اختلاف رہا جس کی طرف اشارہ کیا گیا ان الفاظ مبارکہ میں:﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾(المائدہ:۴۸) "تم میں سے ہر ایک (امت) کے لیے ہم نے ایک (الگ) شریعت اور طریقہ مقرر کیا ہے"۔ اسی کی وضاحت اس حدیث شریف میں ملتی ہے جس کے مطابق نبی کریم ﷺ نے فرمایا:﴿الْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ مِنْ عَلَّاتٍ، وَأُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى، وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ﴾(مسند احمد)"انبیاے کرام باپ شریک بھائی ہیں، ان کی مائیں (یعنی شریعتیں) مختلف ہیں لیکن ان کا دین ایک ہے"۔

پس جس طرح انبیاے کرام کا دین یعنی اصول دین مشترک ہیں لیکن ان کے احکام و فروع میں اختلاف ہوا اور ان کی شریعتیں مختلف رہی ہیں۔ اسی طرح اہلِ سنت کے اصول دین یعنی قرآن و سنت اور اجماع کا ماخذ شریعت ہونا یہ اتفاقی بات ہے اس کے بعد ان کے اصول دین بھی اجماع سے ثابت ہیں جس طرح نبیوں کے دینوں میں کوئی اختلاف نہیں اس طرح اہل سنت کے ہاں ان اصولوں پر کوئی اختلاف نہیں جو ان اصولوں پر آگیا وہ خالص اسلام اور اہل سنت

میں داخل ہوگیا۔ باقی جو ان کے عملی اور فروعی اختلافات ہیں تو وہ اسی طرح کا اختلاف ہے جو انبیائے کرام کی شریعتوں میں رہا ہے۔ جس طرح تمام انبیائے کرام اللہ تعالی کے دین کے برحق ہونے، لزوم عبادت اور پابندی شریعت پر متفق رہے ہیں اسی طرح ائمہ اہل سنت کے ہاں شارع اور مأخذ شریعت ایک ہی ہے البتہ نصوص کے فہم اور اس سے مسائل کے اَخذ کرنے میں ان کا اختلاف ہوا جو فروعات کے متعلق ہے اور اتحاد امت کے منافی نہیں ہے۔

جب اہلیت کے حامل مجتہدین نے اپنی صلاحیت کے مطابق محنت سے اجتہاد کیا اور کسی نتیجے کو پہنچے جو اصلا مختلف تھا دوسرے مجتہد کی رائے کے تو بعض لوگ نے دونوں کو مصیب گردانا اس لیے کہ انہوں نے اپنی استطاعت کے بقدر خدائی تقاضا پورا کر دیا لیکن جمہور اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ اجتہاد میں اختلاف کرنے والے مجتہدین میں سے نفس الامر کے مطابق، عند اللہ ایک ہی مجتہد اپنے اجتہاد میں مصیب ہے اور دوسرے کو مُخطی کہا جائے گا۔ مجتہد مصیب کے لیے دوہرا، اجر ہے جبکہ مجتہد مُخطی کو اپنی خطا میں کوئی گناہ نہیں بلکہ اس کے لیے اکہرا، اجر ہے۔

علماء و مشائخ کا اجتہاد ایک اعتبار سے پیغمبروں کے اجتہاد کے برابر ہے اور ایک اعتبار سے ان میں فرق ہے۔ اپنی حجیت اور لزوم اتباع کے اعتبار سے، معصوم (انبیاے اکرام) اور غیر معصوم (ائمہ اکرام) دونوں کے اجتہاد برابر ہیں کہ دونوں کے اجتہاد کی پیروی شرع میں لازم کی گئی ہے۔ البتہ صحت کے اعتبار سے علماء کا اجتہاد پیغمبروں کے اجتہاد سے مختلف ہے کہ انبیا خدائی حفاظت سے معصوم ہوتے ہیں، ان کے اجتہاد میں خطا کا احتمال نہیں ہوتا ہے۔

بعض اوقات مجتہدین کی آرا میں اختلاف کا ایک سبب یہ ہوتا ہے ایک مجتہد کو کوئی ایسی روایت ملتی ہے جو دوسرے کو نہیں ملتی اور بسا اوقات کسی آیت یا کسی حدیث کی تفسیر میں اختلاف ہوتا ہے جس کے نتیجے میں مجتہدین کے درمیان فروعات میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ مجتہدین کے اختلاف کی وجوہات کثیر ہیں جن کا احاطہ یہاں پیش نظر نہیں ہے۔ یہ جان لینا چاہیے کہ فقہاے کرام کا یہ اختلاف اس آیت کے منافی نہیں ہے کہ جس میں اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ دین قائم کرو اور آپس میں تفرقہ نہ کرو اس لیے کہ اس آیت میں دین کے اصول میں اختلاف کو تفرقہ کہا گیا ہے نا کہ فروع

میں اختلاف کو اور اس لیے بھی کہ فروعات میں اختلاف کرنے والے مجتہدین اصولی طور پر کتاب و سنت اور مصادرِ شریعت پر متفق ہوتے ہیں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ ان کے اختلاف کو تفرقہ قرار دینا درست نہیں ہے۔

البتہ اگر مجتہدین کا کسی امر پر اجماع ہو جائے تو وہ اجماعی موقف چاہے اجتہاد ہی کے نتیجے میں وجود میں آیا ہو، گمراہی اور غلطی سے محفوظ ہو گا کیونکہ قرآن و سنت اس بات پر شاہد ہیں کہ امت کے علماء گمراہی پر جمع نہیں ہوں گے۔ ہم نے مجتہدین کا جو اجر بیان کیا کہ مصیب ہونے کی صورت میں دہرا جبکہ مُخطی کو اکہرا، اجر ملے گا تو یہ اس صورت میں ملے گا جب وہ حتی المقدور، درست رائے تک پہنچنے کے لیے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اجتہاد کریں گے نہ کہ اپنے نفس کی تسکین کے لیے، اور ان کا مقصد، اللہ وحدہ ولا شریک کی عبادت اور کتاب و سنت کا اتباع ہو تو بلا شبہہ یہ اجتہاد انبیاے کرام علیہم السلام کے منہج کے مماثل اور لائق اجر و ثواب ہے۔ مجتہد کو چاہیے کہ وہ اپنے اجتہاد کے موافق حق بات بیان کرے ایسی حق بات جس پر خطا کے احتمال کے باوجود عمل واجب ہے۔ البتہ کسی مجتہد کے لیے یہ بات درست نہیں کہ وہ دوسرے مجتہد پر اپنی اطاعت واجب کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے مجتہد کو کوئی ایسی ظاہر دلیل مل گئی ہو جو پہلے مجتہد پر مخفی رہ گئی تھی۔ اختلافی مسائل میں صحابہ کا یہ طرز عمل تھا کہ وہ غیر منصوص احکام میں اپنے فریق کی کی اجتہادی آرا کو تسلیم کرتے تھے۔

حاصل یہ ہے کہ ہر ایک کو ہر حال میں اللہ کی رضا مطلوب رہے اور ہر موقع کے مطابق اللہ تعالی کی اطاعت و فرمانبرداری بجالائے۔ جو کوئی اجتہاد کا اہل ہو تو وہ اپنے اجتہاد میں اللہ کے اوامر کا خیال رکھے اور جو کوئی اجتہاد کا اہل نہیں ہے تو کسی مجتہد کی تقلید عدل کے ساتھ کرتا رہے۔ ایسا کرنے والے درمیانی راہ پہ چلنے والے شمار کیے جائیں گے کیونکہ اللہ تعالی کسی شخص کو اس کے مقدور سے زیادہ کا مکلف نہیں ٹھراتا۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس اصول پر غور کریں کہ یہ ایک عظیم اور نافع اصول ہے۔

مجموع الفتاوى،طبع مجمع الملك فهد، الجزءُ التاسعِ عشرَ ، كتاب أصول الفقه ، باب وجوب الاجتماع فی الدين

فتاویٰ یسئلونک

دار الافتاء والارشاد

سوال: ایک روایت ہے کہ عامر بن سعد کہتے ہیں کہ میں ایک شادی میں قرظہ بن کعب اور ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہما کے پاس پہنچا، وہاں لڑکیاں گانا گا رہی تھیں، میں نے کہا: آپ دونوں رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں اور اہل بدر میں سے ہیں، اور یہ کچھ (گانا) آپ کے سامنے ہورہا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: اگر چاہو تو ہمارے ساتھ بیٹھ کر سنو اور چاہو تو چلے جاؤ، ہمیں شادی کے موقعے پر لہو کی رخصت دی گئی ہے۔ کیا یہ روایت مستند ہے؟ اور اگر مستند ہے تو اس کی وضاحت فرمادیں۔

جواب: سوال میں جس روایت کا ذکر کیا گیا ہے وہ سنن نسائی میں روایت کی گئی ہے:

عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدٍ، قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى قُرَظَةَ بْنِ كَعْبٍ، وَأَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ، فِي عُرْسٍ، وَإِذَا جَوَارٍ يُغَنِّينَ، فَقُلْتُ: أَنْتُمَا صَاحِبَا رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمِنْ أَهْلِ بَدْرٍ، يُفْعَلُ هَذَا عِنْدَكُمْ؟ فَقَالَ: اجْلِسْ إِنْ شِئْتَ فَاسْمَعْ مَعَنَا، وَإِنْ شِئْتَ اذْهَبْ، قَدْ «رُخِّصَ لَنَا فِي اللَّهْوِ عِنْدَ الْعُرْسِ» (سنن النسائی، کتاب النکاح، اللھو والغناء عند العرس)

ترجمہ: حضرت عامر بن سعد فرماتے ہیں کہ میں حضرت قرظہ بن کعب اور حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شادی میں پہنچا، تو وہاں بچیاں گا رہی تھیں، میں نے کہا: آپ دونوں رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں اور اہل بدر میں سے ہیں، اور یہ (گانا) آپ کے سامنے ہورہا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: اگر چاہو تو ہمارے ساتھ بیٹھ کر سنو اور چاہو تو چلے جاؤ، ہمیں شادی کے موقعہ پر لہو کی رخصت دی گئی ہے۔

عربی زبان میں غنا کا لفظ صرف گانے کے لیے استعمال نہیں ہوتا، بلکہ ایک حدیث میں قرآن کریم کو خوبصورت آواز اور اچھے انداز سے پڑھنے کے لیے بھی غنا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں روایت ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ : لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ. (صحيح البخاري، كتاب التوحيد)

ترجمہ: جو قرآن کریم کو خوش الحانی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔

ابن جوزی رحمہ اللہ نے غنا کے مختلف معانی بیان فرمائے ہیں، جن میں آواز کی خوبصورتی، مشغول ہونا اور لذت حاصل کرنا بھی شامل ہیں۔آپ لکھتے ہیں : اختلفوا في معنى قوله:''يتغنى''على أربعة أقوال: (أحدها): تحسين الصوت. (والثاني): الاستغناء. (والثالث): التحزن. قاله الشافعي. (والرابع): التشاغل به، تقول العرب: تغنى بالمكان أقام به. قال الحافظ: وفيه قول آخر، حكاه ابن الأنباري في ''الزهر'' قال: المراد به التلذذ، والاستحلاء له. (ذخيرة العقبى، كتاب الامامة، تزيين القرآن بالصوت)

اس لیے سنن نسائی کی روایت میں موجود لفظ غناء سے (ناجائز) گانے والا معنی مراد نہیں لیا جاسکتا۔

ذخیرۃ العقبی میں اس روایت کی تشریح میں حضرت قرظہ بن کعب اور حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہما کے جواب کا خلاصہ اور حاصل یہ بتلایا ہے کہ بچیاں جو گا رہی تھیں وہ اس گانے کے حکم میں نہیں ہے جو دین اسلام میں ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہما (جنھیں اللہ نے خصوصی شرف سے نوازا ہے)وہ باوجودیکہ انھیں تنبیہ کی گئی، کیسے جان بوجھ کر گناہ کی مجلس میں شریک رہ سکتے تھے۔

حاصل جوابهما أن هذا ليس من الغناء المحرم، بل هو رُخّص في مثل هذه المناسبة، حيث يُطلب إشهار النكاح، وإعلانه؛ تمييزًا بينه، وبين السّفاح، فلا ينبغي أن تنكر علينا، بل إن أعجبك، فاجلس معنا، واستمع، وإلا فاذهب حيث شئت. (ذخيرة العقبى، كتاب النكاح، اللهو والغناء عند العرس)

دوسری بات یہ کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں شادی یا خوشی کے موقعے پر پڑھے جانے والے

اشعار بھی بیان کیے ہیں، جو بچیاں پڑھا کرتی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ دف بھی بجاتی تھیں۔ ممکن ہے کہ حضرت قرظہ بن کعب اور حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہما کی موجودگی میں بھی وہی اشعار یا اسی قسم کے اشعار پڑھے جارہے ہوں اور حضرت عامر نے انھیں ناجائز سمجھ کر سوال کیا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ الفاظ ایسے نہیں کہ ان کے پڑھنے کو ناجائز کہا جائے۔

فَقَالَ فَهَلْ بَعَثْتُمْ مَعَهَا جَارِيَةً تَضْرِبُ بِالدُّفِّ وَتُغَنِّي قُلْتُ تَقُولُ مَاذَا قَالَ تَقُولُ أَتَيْنَاكُمْ أَتَيْنَاكُمْ فَحَيَّانَا وحياكم وَلَوْلَا الذَّهَب الْأَحْمَر مَا حلت بواديكم وَلَوْلَا الْحِنْطَة السمراء مَا سَمِنَتْ عَذَارِيكُمْ . (فتح الباري، كتاب النكاح، باب الانماط)

ترجمہ: (ایک انصاریہ صحابیہ فارعہ بنت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی کے موقعے پر رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا: تم نے فارعہ کے ساتھ کوئی بچی نہیں بھیجی کہ وہ دف بجاتی اور اشعار پڑھتی، (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ) میں نے کہا: وہ کیا پڑھتی؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: وہ یہ اشعار پڑھتی (جو بچیاں پڑھا کرتی ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے:) ہم تمھارے پاس آئے، اللہ تعالی ہمیں بھی برکت و سلامتی دے اور تمھیں بھی، اگر تمھارے پاس سرخ سونا نہ ہوتا تو یہ دلہن تمھاری وادی میں نہ اترتی۔، اور اگر سرخ گیہوں نہ ہوتے تو تمھاری کنواری بیٹیاں موٹی نہ ہوتیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سوال میں جس مجلس کا ذکر کیا گیا ہے اس میں ناجائز کلمات یا ناجائز اشعار وغیرہ نہیں پڑھے جارہے تھے، جو شرعاً ممنوع ہیں، اسی وجہ سے دونوں بدری صحابہ کرام اس مجلس میں بیٹھے رہے۔ اگر ممنوع اشعار ہوتے تو دونوں حضرات اس پر نکیر فرماتے۔ لہذا اس روایت سے حرام گانوں کی اجازت یا ایسے گانوں کی محفل میں شرکت کے جواز پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

نعت

مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ

تَنَم فَرسُودَہ جاں پَارہ زِہجراں یارَسُول اللہ | دِلَم پژمُردَہ آوارَہ زِعصیاں یَارَسُول اللہ

میرا جسم ناکارہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے، آپ کی جدائی میں، یارسول اللہ ! میرا دل بھٹک رہا اور دل کا پھول گناہوں کے بوجھ سے مُرجھا چکا ہے، یارسول اللہ !

چُوں سُوے مَن گُزر آرِی مَنِ مِسکیں زِنَاداری | فِدائے نقشِ نعلینَت کُنم جاں یَارسُول اللہ

کبھی خواب میں اس عاجزِ مسکین اور غریب نادار سائل کو اپنا جلوہ دکھادیں، تاکہ میں آپ کے نقشِ پا پر فدا ہوجاؤں، یارسول اللہ !

زِکردہ خویش حَیرانم سِیاہ شد روزِ عِصیَانَم | پَشیمَانم پَشیمَانم پشِیماں یَارسُول اللہ

میں نے جو کچھ کیا ہے اس پر بہت حیران ہوں، روزِ حساب میرا اعمال نامہ گناہوں کی بہتات سے سیاہ ہوگا، میں انتہائی پشیماں اور سخت شرمندہ ہوں، پشیمان ہی پشیمان ہوں، یارسول اللہ !

زِجَامِ حُبِّ تو مَستَم بَہ زَنجیرِ تو دِل بَستَم | نمی گویم کہ مَن ہستم سُخن دَاں یَارسُول اللہ

میں آپ کی محبت میں مَست ہوں اور آپ کے عشق کی زنجیر سے میرا دل بندھا ہوا ہے، میں ہرگز دعویٰ نہیں کرتا کہ میں ایک بہت بڑا شاعر ہوں، یارسول اللہ !

چُوں بازُوے شفاعَت راکُشائی بَرگُناہ گاراں | مَکُن محروم جامی را، دَراآں یَارسُول اللہ

جب روزِ قیامت آپ اپنی شفاعت کا بازو گناہ گاروں پر پھیلائیں تو اُس روز اِس عاجز جامیؔ کو محروم نہ رکھیے گا، اُس جان جوکھوں کی نازک گھڑی میں، یارسول اللہ ! صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم